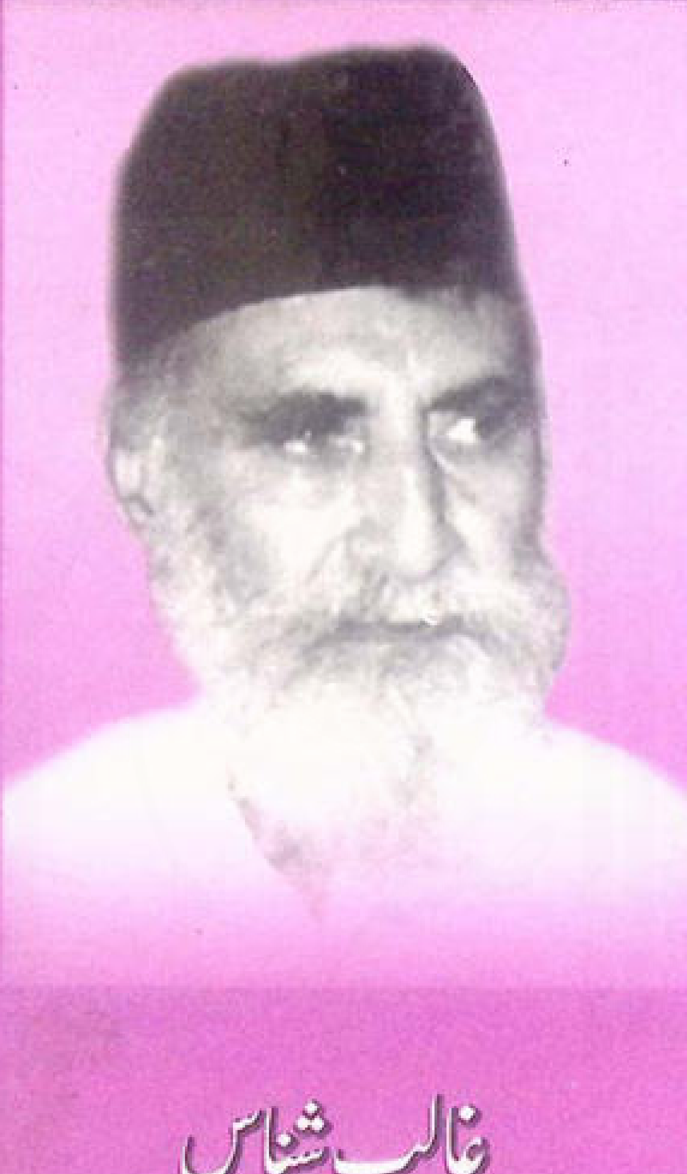


غالب شناس
مولانا امتیاز علی خان عرشی

عبدالرحمٰن بٹ

غالب شناس
مولانا امتیاز علی خان عرشیؔ

عبدالرحمٰن بٹ

اظہار سنز
۱۹۔ اُردو بازار لاہور

فہرست

◆◆◆

پیش لفظ

تفہیم غالب کی روایت انیسویں صدی میں ہی شروع ہو چکی تھی جو بیسویں صدی میں اپنے عروج تک پہنچی۔ اُردو کے نام ور اربابِ تحقیق و انتقاد نے غالبؔ کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔ ان میں مولانا الطاف حسین حالیؔ، حسرت موہانی، مفتی انوار الحق، عبدالرحمٰن بجنوری، ڈاکٹر عبداللطیف، رام بابو سکسینہ، یاس یگانہ چنگیزی، شیخ محمد اکرام، غلام رسول مہر و دیگر اسمائے گرامی ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

اسی روایت کے تسلسل میں اہم نام مولانا امتیاز علی خاں عرشیؔ کا ہے، جنھوں نے غالب کے خطوط تحقیق و تدقیق کے بعد دیوانِ غالب کا مستند نسخہ مدون کیا، جو نسخہ عرشی کے نام سے معروف ہے۔ ان کی شخصیت مطالعۂ غالب کے حوالے سے اساسی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں ۱۹۸۰ء۔۱۹۸۲ء کے تدریسی میقات میں راقم کو مولانا عرشی کی شخصیت و فن پر مقالہ بعنوان "مولانا عرشی بطور غالب شناس" لکھنے کا اعزاز بخشا گیا۔ مقالہ کی نگرانی کی ذمہ داری اُستادِ گرامی پروفیسر ڈاکٹر عبیداللہ خاں صاحب کو تفویض ہوئی۔ راقم نے مقدور بھر تگ و دو کے بعد ایک جامع اور وقیع مقالہ تحریر کیا جسے اساتذہ نے بہ نظرِ استحسان دیکھا اور حوصلہ افزائی فرمائی۔ ان بزرگوں میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر سہیل احمد خان، ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن جیسی نابغۂ روزگار علمی و ادبی شخصیات شامل ہیں۔

گزشتہ تیس برس سے یہ مقالہ جامعہ پنجاب کی لائبریری اور میرے ذاتی کتب خانے کی الماری میں پڑا رہا۔ میرے رفیقِ کار عزیزم محمد عرفان احسن پاشا نے تحریک دلائی کہ ایسے تحقیقی کام کو جو غالبیات میں تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک اہم ماخذ ثابت ہو سکتا ہے، قعرِ گم نامی سے نکال کر منصۂ شہود پر لانا چاہیے۔ اس سے مجھے حوصلہ ہوا اور میں اسے طبع کرانے کے لیے سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ ان تیس برسوں میں تحقیق کی دنیا میں بہت کچھ اضافہ ہو چکا تھا اور تیس برس پرانی معلومات کو موجودہ دور میں وہ وقار حاصل نہ رہا جو ہونا چاہیے تھا لہٰذا میں نے اسے تاریخی و تحقیقی اعتبار سے زیادہ جامع اور مؤثر بنانے کے لیے معاصر تواریخ کو ذہن میں رکھتے

ہوئے تجدید کے عمل سے گزرا جس کے بعد یہ مقالہ تصنیف کی صورت اختیار کرتے کرتے کافی حد تک جدید و وقیع ہو چکا ہے۔ راقم اپنی ان کوششوں میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے اس کا فیصلہ تو قارئین اور اربابِ نقد و نظر ہی کر سکتے ہیں۔

اس کتاب کو چھے ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں مولانا عرشی کی شخصیت و سوانح، دوسرے میں مولانا عرشی تک غالب شناسی کی روایت، تیسرے باب میں مولانا عرشی کے تحقیقی و تدوینی کام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں مکاتیبِ غالب مرتبہ عرشی اور پانچویں باب میں دیوانِ غالب مرتبہ مولانا عرشی کے حوالے سے سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ آخری باب مولانا عرشی کی متفرق علمی و ادبی خدمات از قسم مخطوطات کی جمع و تدوین اور دیگر حوالوں سے ان کی علمی شخصیت پر مشتمل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مقالے کے نتائج بھی اخذ کیے گئے ہیں۔

میرا فرض بنتا ہے کہ میں ان تمام احباب کا شکریہ ادا کروں جنھوں نے اس کتاب کو منظرِ عام پر لانے کے لیے کسی بھی قسم کی معاونت کی۔ بطورِ خاص میرے رفیقِ کار جناب عمران تبسم اور جناب محمد اکرام خالد شامل ہیں۔ کمپوزنگ اور پروف خوانی کے صبر آزما مراحل کو خندہ پیشانی سے طے کرنے اور کتاب میں معنوی و صوری خوبیاں پیدا کرنے کے ضمن میں تصور حسین شاہ اور محمد علی انجم رضوی بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔ صمیم قلب سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ احباب کو صحت و تندرستی اور جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)

اجازت سے پہلے قارئین کی خدمت میں یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا عرشی پر تحقیق کے دوران ان کی جو مختلف حیثیات سامنے آئیں اور ان کے صاحب زادے اکبر علی خاں عرشی زادہ اور جناب پروفیسر صابر حسین صابر سنبھلی (صدر شعبۂ اُردو، ایم۔ ایچ کالج، مراد آباد، بھارت) کا اتائی ماخذات کی فراہمی کے سلسلے میں بے حد ممنون ہوں۔ ان حضرات سے مواد کے حصول کے لیے جو خط و کتابت رہی ان کو سامنے لانے کے لیے بھی جلد ہی چند تصانیف بحوالہ عرشی سامنے آئیں گی تاکہ مولانا عرشی پر تحقیق کرنے والے نئے محققین کے لیے سہولت اور سمت نمائی کا کام ہو سکے۔

پروفیسر عبدالرحمٰن
صدر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ شالیمار کالج، لاہور
۰۳۲۲۔۴۴۰۷۷۸

◆◆◆

پہلا باب

مولانا امتیاز علی خان عرشی —— مختصر سوانحی خاکہ

◆◆

نام اور ولادت

تاریخ ادب میں ولادت کی حتمی تاریخ کا تعین بعض اوقات بڑا متنازعہ فیہ مسئلہ بن جاتا ہے۔ مولانا امتیاز علی خان عرشی اس لحاظ سے بڑے خوش قسمت واقع ہوئے ہیں کہ ان کی تاریخِ ولادت بالاتفاق مسلم ہے۔ عشرت رحمانی اور مالک رام کے مطابق مولانا امتیاز علی خان عرشی کی پیدائش ۸ر دسمبر ۱۹۰۴ء مطابق ۲۹ر رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ یوم پنج شنبہ ان کے آبائی مکان محلہ پھلوار "رام پور" میں ہوئی۔ اکبر علی خان عرشی زادہ نے آپ کی پیدائش کا وقت عصر اور مغرب کے درمیان بتایا ہے۔[1]

مولانا عرشی کا پورا نام امتیاز علی خان اور عرشی تخلص ہے۔ ان کی طبیعت بچپن ہی سے شعر گوئی کی طرف مائل تھی۔ اوائل میں انھوں نے "بھین خان" نامی ایک ڈاکو کی موت کا واقعہ منظوم کیا جو ان کی فطری صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ رام پور جو شعر و ادب اور شاعروں کی سرزمین ہے۔ ان کی موزونی طبع کے لیے سونے پہ سہاگہ واقع ہوئی۔ وہاں انھیں اوائل عمری سے شاعروں کی صحبت میسر آئی اور مشاعروں میں شرکت کے کئی مواقع ملے۔ جن سے یہ شوقِ شاعری پروان چڑھتا رہا۔ جب مولانا موصوف تعلیم کی غرض سے لاہور تشریف لائے تو یہاں بھی شاداں بلگرامی اور عندلیب شادانی جیسے فضلاء کی صحبت نصیب ہوئی۔ اس طرح ان کے ذوقِ شعری کو مزید تقویت پہنچی۔ اکبر علی عرشی زادہ کے مطابق مولانا عرشی کا یہ مجموعہ کلام جو غزلوں، نظموں، رباعیات کی صورت میں ہے تا حال زیور طباعت سے آراستہ

نہیں ہو سکا۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ تا حینِ حیات اپنے کلام کو ہمیشہ اساتذہ کے کلام سے کم تر سمجھتے رہے اور ان کے مقابلہ میں اس کی اشاعت و طباعت مناسب نہ سمجھی۔ اُن کا مجموعۂ کلام غزلوں، نظموں اور رباعیات پر مشتمل ہے۔

خاندان:

مرزا غالب اپنے خاندان اور ترکی النسل ہونے پر ہمیشہ اتراتے رہے اور مولانا عرشی غالب کے محقق اور نقاد ہونے کے باوجود اپنے افغانی النسل ہونے پر کبھی فخر نہ کرتے تھے۔ بل کہ ہمیشہ منکسر المزاجی سے کام لیتے تھے۔

مولانا عرشی کا سلسلۂ نسب افغانستان کے ''یوسف زئی'' خاندان کی بطن در بطن شاخ ''حاجی خیل'' سے ملتا ہے۔ ''یوسف زئی'' اس عہد میں ایک طاقت ور قبیلہ سمجھا جاتا تھا۔ حاجی خیل، قبیلہ کا رئیس رواجِ زمانہ کے مطابق ''خان'' کہلاتا تھا۔ اسی قبیلہ کے ''خان'' ''مشرف خان'' مولانا عرشی کے جدِ امجد تھے۔

اٹھارویں صدی کے نصف آخر سے قبل تاج دارِ دہلی کی حیثیت شہ شطرنج سے زیادہ نہیں تھی۔ اس بدنظمی سے فائدہ اٹھانے کے لیے بہت سے اولوالعزم سردار افغانستان اور ایران سے قسمت آزمائی کی خاطر ہندستان کا رخ کرتے اور یہاں پہنچ کر اپنا ہم خیال جتھا تیار کرتے اور مقامی لوگوں کے تعاون سے چھوٹی چھوٹی ریاستیں یا جاگیریں قائم کرنے میں کامیاب ہوتے۔

مولانا عرشی کے جدِ اعلا مشرف خان کے چھوٹے بھائی مقرب خان بھی اپنے بھائی سے غالباً کسی بات پر ناراض ہو کر افغانستان سے اسی طرح یہاں قسمت آزمائی کے لیے آئے۔ مقامی لوگوں سے مل کر موجودہ رام پور کے گرد و نواح کے علاقے میں انھوں نے نئی جاگیر قائم کر لی۔

جس زمانے میں رام پور کی ریاست فیض اللہ خان کے زیرِ نگین آ گئی تھی اسی عہد میں مقرب خان کے پوتے سعید خان ایک مقامی رئیس کی حیثیت سے نمایاں تھے۔ والئ

ریاست فیض اللہ خان بڑے سیاسی ذہن کا شخص تھا۔ اس نے رؤساء کی اولاد سے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیاں کرنا شروع کر دیں تا کہ استحکام سلطنت میں کوئی کمزوری راہ نہ پا سکے۔ اسی خیال سے اب اس نے سعید خان سے بھی ان کی دو بیٹیوں سے شادی کا پیغام دیا۔ سعید خان نے عذر کے طور پر کہا کہ وہ اپنے آبائی خاندان میں نسبت طے کر چکے ہیں۔ چناں چہ اس وقتی عذر کو خاندانی اصول کی طرح نبھانے کے لیے انھوں نے اپنے آبائی وطن سے "مشرف خان" کے دو پوتوں کو ہندستان بلایا۔ ان میں سے ایک "رحم باز خان" تھے۔ جو مولانا عرشی کے پردادا تھے۔

رحم باز خان کے اکلوتے بیٹے اکبر علی خان تھے جنھوں نے اپنے آبائی پیشے سپہ گری کے برعکس علم و فضل کو اپنی زندگی کا مشغلہ بنایا۔ اور وہ (مولانا اکبر علی خان) اپنے عہد کے محدث مانے گئے۔ انھوں نے اپنی تمام عمر حدیث، فقہ اور علم کلام کے سمجھنے سمجھانے میں وقف کی۔

اکبر علی خان کے چھ صاحب زادے اور تین صاحب زادیاں ہوئیں۔ صاحب زادوں میں مولانا جعفر علی اپنے والد کے جانشین بنے البتہ سب سے چھوٹے بیٹے مختار علی خان جو مولانا عرشی کے والد ماجد تھے اپنی صغیر سنی کی وجہ سے اس فیض سے بہرہ ور نہ ہو سکے۔ چوں کہ والد وفات پا گئے تھے جس سے تعلیم کا سلسلہ دیگر غیر ضروری مصروفیات کی نذر ہو گیا تاہم ذاتی اکتساب اور گھریلو تعلیمی ماحول کی وجہ سے اپنے عہد کے تعلیم یافتہ لوگوں میں شمار ہوئے۔

عملی زندگی کے آغاز میں انھوں نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر گھوڑوں کی تجارت کا گر سیکھا اور یہیں سے انھیں گھوڑوں کی بیماریوں کے علاج کا بھی تجربہ حاصل ہوا۔ نواب خلد آشیان نے انھیں فوج میں ملازمت دے دی تھی مگر انھوں نے اس میں کوئی خاص دل چسپی نہ لی بالآخر اس ملازمت کو خیر باد ہی کہہ دیا۔ تجارت میں خسارے کے سبب اُن کے بھائی مشرف علی خان کو رام پور چھوڑنا پڑا۔ مختار علی خان بھی ان کے پیچھے "دھار"

چلے گئے۔ دوبارہ رام پور واپس آئے تو امپیریل سروسز لانسرز میں ملازم ہو گئے۔ صاف گو اور خوددار تھے اسی لیے افسران بالا سے نبھ نہیں سکتی تھی گویا گھوڑوں کے علاج نے انھیں سرکاری ملازمت میں آنے میں مدد ضرور دی۔ اسی بنا پر سرکاری سرپرستی میں لاہور میں ۱۸۹۹ء میں حیوانات کے علاج کی تعلیم کی خاطر آئے اور یہاں سے اعلا نمبروں میں وظیفہ کے ساتھ سند لے کر گئے۔ متعدد دوسرے محکموں میں کام کرنے کے بعد سرکاری اصطبل کے منصرم مقرر ہوئے جو اُس زمانے میں بڑی ذمہ داری کا عہدہ تھا۔ اسی عہدے سے سبک دوش ہوئے اور وظیفہ حسنِ خدمت پایا۔

مختار علی خان نے کئی شادیاں کیں لیکن ان کی اولاد میں صرف دو لڑکے ہی زندہ بچے۔ ان میں ایک امانت علی خان ہیں جو آج کل پاکستان میں مقیم ہیں اور دوسرے امتیاز علی خان عرشی۔ مولانا عرشی ان کی پہلی بیوی کے بطن سے تھے۔ مولانا عرشی کی والدہ بھی ''محمد خیل'' قبیلہ کے ایک صوفی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، یہ خاندان نواب فیض اللہ خان کے عہد میں ہی رام پور آیا تھا۔

تعلیم:

مولانا عرشی کی والدہ ان کی ولادت کے اڑھائی برس بعد ہی راہی ملک عدم ہو گئی تھیں۔ لیکن سوتیلی ماں نے ممتا کی اس کمی کو محسوس نہیں ہونے دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مولانا عرشی کبھی بھی دلی طور پر ان سے مانوس نہ ہو سکے۔ پانچ برس کے تھے جب ان کی ''بسم اللہ'' ہوئی۔

پہلے جعفر علی (مرحوم) کے مکتب میں پانچویں برس میں مولانا عرشی کی تعلیم کا آغاز رسمِ بسم اللہ سے ہوا۔ اس کے بعد پرائمری کی تعلیم حاصل کی۔ انگریزی تعلیم کی طرف بڑھتے ہوئے رجحان کے پیشِ نظر انگریزی پڑھانے کے لیے ماسٹر رکھا گیا لیکن مولانا عرشی کی عدم توجہی کے باعث یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مکتب میں قرآن کریم کی اور پرائمری اسکول میں فارسی کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ والدین کی خواہش انہیں عالمِ دین بنانے کی تھی۔ اسی لیے میزان

الصرف کی تدریس کی غرض سے الگ اُستاد رکھا گیا اور حکیم عبدالرشید خاں کے سپرد ہوئے۔ حکیم عبدالرشید، مولانا عبدالحق خیر آبادی کے شاگردوں میں سے تھے۔ اس لیے مولانا عرشی پر بھی خیر آبادی سلسلے کی معقولات کا اثر ہوا اور منطق اور فلسفہ کا رنگ چڑھا۔ اسی دور میں طب کی تعلیم کے لیے حکیم عبدالحمید خان دہلوی کے شاگرد رہے۔ اس تعلق کی بنا پر حکیم اجمل خان نے انھیں والی رام پور نواب حامد علی خان کا طبیب خاص مقرر کروا دیا تھا۔ مولانا عرشی کے والد نے حکیم صاحب سے صرف و نحو پڑھانے کے لیے کہا۔ اس لیے وہ انکار نہ کر سکے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عرشی صرف و نحو میں کم توجہ دیتے تھے اور حکیم صاحب کے دوست احباب کی گفت گو پر زیادہ کان دھرتے تھے۔ حکیم صاحب نے بھی عربی قواعد کے ساتھ ساتھ طب کی فارسی کتب شروع کروا دیں۔ میزان الطب، شفا الامراض پوری پڑھ ڈالیں۔

اس کے بعد مدرسہ مطلع العلوم میں داخل ہوئے جس کے صدر مدرس مولوی سعید احمد تھے یہاں سے مولانا عرشی نے قواعد کے علاوہ فارسی کی اہم درسی کتب گلستان، بوستان، یوسف زلیخا، سکندر نامہ وغیرہ پڑھیں۔ اس وقت ان کی عمر تیرہ چودہ برس تھی۔ یہیں سے انھوں نے عربی لکھنے اور بولنے کی مشق کی اور قرآن کریم اور اس کے متعلقات کا مطالعہ کیا۔ تاہم تفسیر اور فقہ پر خاص توجہ نہ دی اور عقلی علوم کی طرف زیادہ متوجہ رہے۔ مولانا سعید کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے اعلا اخلاق کا بھی مولانا عرشی پر گہرا اثر ہوا۔

۱۹۲۳ء میں مولوی عالم کی سند پنجاب یونیورسٹی سے لی اور اسی سال اورینٹل کالج لاہور میں مولوی فاضل کے امتحان کے لیے داخلہ لے لیا۔ اتفاق سے شاداں بلگرامی مدرسہ عالیہ رام پور کے فارسی کے صدر تھے وہ یہاں تبدیل ہو کر آ گئے اور مولانا عرشی کو یہاں ان کی صحبت میسر آ گئی۔

اس زمانہ میں اورینٹل کالج کے بعض اساتذہ ملک گیر شہرت کے حامل تھے۔ مولانا نجم الدین معقولات میں، مولانا سیّد طلحہ تفسیر میں اور مولانا عبدالعزیز میمن ادب میں

سند سمجھے جاتے تھے۔ اس مقام میں مولانا عرشی مولانا طلحہ کے زیرِ اثر رہے اور اپنے رجحان معقولات کو یہاں بھی مستحکم کیا۔ لاہور سے مولوی فاضل کی سند درجہ اوّل میں لینے کے بعد مولانا عرشی نے رام پور میں مدرسہ عالیہ کے درجہ اوّل میں داخلہ لیا۔ اس وقت اس درجہ کے ستاد مشہور زمانہ مولانا فضل حق رام پوری تھے۔ مولانا عرشی نے ان سے فلسفہ اور منطق کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۴ء میں مدرسہ عالیہ رام پور سے فارغ ہوئے۔ اسی سال لاہور آ گئے اور پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے منشی فاضل کی سند بھی اوّل درجہ میں حاصل کی۔ ۱۹۲۶ء میں صرف انگریزی کا امتحان دے کر انگریزی کی سند بھی حاصل کر لی۔

عملی زندگی کا آغاز:

مولانا عرشی کے والد انھیں اُن کے دادا کی طرح عالمِ دین دیکھنا چاہتے تھے۔ مولانا عرشی کے اُستاد مولانا سعید احمد انھیں اعلا درجہ کا اُستاد یا مدرس دیکھنے کے متمنی تھے۔ جب کہ خود مولانا اپنے آپ کو بحیثیت تاجر پسند کرتے تھے۔ بہر حال مولانا عرشی کی خواہش تو پوری نہ ہو سکی تاہم انھیں ملازمت ایسی مل گئی جو ان کے والد اور اُستاد کی خواہشات کی آئینہ دار تھی۔

سفیرِ ندوہ:

اس وقت ''ندوۃ العلماء'' برصغیر کے چند گنے چنے اداروں میں سے ایک ادارہ تھا۔ مولانا عرشی ابھی جوان رعنا ہی تھے کہ اس زمانہ میں ''دائرۃ المعارف'' حیدر آباد دکن کے اہم رکن مولانا سید ہاشم ندوی رام پور میں علمی کاموں کی غرض سے آتے رہتے تھے۔ اتفاقاً ایک روز ان کی ملاقات مولانا عرشی سے ہو گئی وہ ان سے بے حد متاثر ہوئے۔ اس جواں خیز پٹھان کے زاہدانہ عادات واطوار نے بزرگ سید کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

مولانا ہاشم ندوی رام پور سے لکھنو گئے تو ''ندوۃ العلماء'' کے ناظم ڈاکٹر عبد العلی سے ملے۔ مولانا ہاشم ندوی سے ڈاکٹر موصوف نے برسبیل تذکرہ کہا کہ انھیں ''ندوۃ العلماء''

کے لیے ایک سفیر کی ضرورت ہے۔ سفیر ندوہ اس شخص کو کہتے تھے جو "ندوۃ العلماء" کی ترقی کی خاطر ملک کے مخیر اور صاحب حیثیت افراد کے پاس جاکر ان سے اس ادارے کے لیے چندہ مانگتا اور اس کی ترقی کے لیے تعاون حاصل کرتا۔ ڈاکٹر عبدالعلی اس ایک سفیر کی اسامی کے لیے ازحد فکر مند تھے۔ مولانا ہاشم ندوی چوں کہ مولانا عرشی سے رام پور میں مل کر گئے تھے اس لیے انھوں نے فوراً ان کا نام تجویز کر دیا۔ اس لیے کہ مولانا ہاشم ندوی کی نگاہ میں اس عمر میں بھی اگر کوئی متحمل مزاج شخص ہوسکتا ہے تو مولانا عرشی ہی تھے۔ اس سلسلے میں مالک رام رقم طراز ہیں:

> "مولانا رام پور میں عرشی صاحب سے مل کر ہی تو لکھنؤ گئے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے ان کا نام لیا کہ یہ اس کام کے لیے بہت موزوں شخص ہیں اور جب وہ لکھنؤ سے واپس رام پور آئے تو عرشی صاحب سے اس کا ذکر کیا اور ترغیب دی کہ یہ آسامی قبول کرلیں۔ قصہ کوتاہ عرشی صاحب "سفیر ندوہ" مقرر ہوگئے۔"[۲۰]

مولانا عرشی سفیر ندوہ کی حیثیت سے مختلف مقامات پر لوگوں سے ملنے کی غرض سے گئے مثلاً بہرائچ، روہیل کھنڈ کے مراکز، شاہ جہاں پور، بریلی، مرادآباد، بھوپال وغیرہ وغیرہ۔ اس مقصد میں انھیں ادارے کی توقع سے کہیں زیادہ کامیابی ہوئی۔ البتہ بریلی میں ایک ایسا سانحہ پیش آیا جس کی وجہ سے وہ پھر کبھی بھی ندوہ کے سفیر کے طور پر خدمات انجام دینے کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔ ہوا یوں کہ بریلی چوں کہ مولانا احمد رضا خان کا وطن ہے اور اُن کے سخت گیر اور قدیم خیالات کے مطابق "ندوۃ العلماء"، "ندوۃ الملحدین" تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے خطبات میں "ندوۃ العلماء" کی تکفیر کے فتوے بھی جاری کیے تھے۔ اس سے یہاں کا ماحول "ندوۃ العلماء" کے حق میں مناسب نہیں تھا۔ مولانا عرشی بریلی میں ایک شخص کے یہاں گئے تو وہ "ندوۃ العلماء" کا نام سنتے ہی تیغ پا ہوگیا اور اس ادارے اور اس سے وابستہ اشخاص کی توہین کرنے لگا۔ مولانا عرشی کو یہاں سے اپنا سا منھ لے کر واپس آنا پڑا۔ اس حادثہ کے بعد انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔

تجارت:

مولانا کو تجارت کا بہت شوق تھا۔ بعض احباب کے ساتھ مل کر تجارت کا سلسلہ شروع کیا مگر سرمایہ کم اور تجربہ کم تر، بل کہ ندارد، اس لیے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنے احباب کی رقم تلف کرنے کا احساس مولانا عرشی کو درپے رہا۔ چناں چہ انھوں نے ہمت نہ ہاری۔ آخر کار دو سال کی محنت کے بعد احباب کی پائی پائی لوٹا دی۔ اس طرح ان دو ناخوش گوار تجربات نے انھیں دوبارہ کسی کاروبار کی طرف منھ نہیں کرنے دیا۔ بالآخر تصنیف و تالیف کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا اور اس کو اپنا نصب العین تصور کرلیا۔

ملازمت بطور ناظمِ کتب خانہ عالیہ، رام پور:

کتب خانہ عالیہ، رام پور برصغیر کے ان عظیم اور نادر کتب خانوں میں سے ایک ہے جنھیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ اس کتب خانہ کی داغ بیل تو نواب سعید خان کے عہد (۱۸۳۰ء تا ۱۸۵۶ء) میں پڑی تھی لیکن بعد میں مسند نشین ہونے والے تمام والیانِ ریاست نے اپنی مقدور بھر صلاحیتوں اور علم دوستی کے طور پر اس کتب خانہ کو فروغ دیا۔ اس کتب خانہ میں دنیا بھر کی نادر اور نایاب کتب جمع ہوتی رہیں جو تشنگانِ علم کی پیاس بجھاتی رہی ہیں اور آج بھی یہ ساقی گری جاری ہے۔ اس کتب خانہ کے نوادرات کے بارے میں مالک رام لکھتے ہیں:

> ''اس وقت یہاں پندرہ ہزار تو صرف خطی نسخے ہی ہیں اور ایک ہزار کے قریب ان کے علاوہ، مخطوطات میں عجیب و غریب نوادر ہیں۔ مختصراً یہ کہ عربی اور فارسی کے چھ چھ ہزار قلمی نسخے ہیں۔ اُردو کے تقریباً ڈیڑھ ہزار، ہندی اور سنسکرت کے ایک ایک ہزار، اور تو اور تمل کے بھی ڈیڑھ سو نسخے ہیں۔ ترکی اور پشتو کے پچاس ہیں۔ ۱۹۵۷ء میں ریاست لوہارو کا کتب خانہ بھی یہاں منتقل ہوگیا تھا۔ اس کے لیے ''لوہارو سیکشن'' الگ رکھا گیا ہے۔ اس میں بھی تقریباً تین سو مخطوطا ہیں تقریباً ۲۷ ہزا مطبو

کتابیں ان کے علاوہ ہیں۔ "لوہارو کلیکشن" کی ساڑھے تین ہزار ان پر مستزاد۔ ان میں سے زیادہ تعداد اُردو کتابوں کی ہے یعنی تقریباً ستر ہزار"۔ [۳]

جس قدر یہ کتب خانہ اہم ہے اُسی قدر اس کے لیے کسی اہم اور محنتی شخص کی بھی ضرورت تھی جو اس عظیم اَدبی ذخیرہ کو ورثہ سمجھ کر سنبھال سکے۔ شروع میں امیر مینائی اور حکیم اجمل بھی اس کے ناظم تھے۔ اس کے بعد حافظ احمد علی خان شوق بطور منصرم خدمات انجام دیتے رہے۔ چوں کہ حافظ شوق کو دیگر ریاستی اُمور میں شرکت میسر تھی۔ وہ اس طرف کم توجہ دیتے۔ اسی لیے انھوں نے اپنے بیٹے شجاعت علی خان کو یہ ذمہ داری سونپ رکھی تھی۔ شوق صاحب کے سبک دوش ہونے پر اس عہدے کے لیے ان کے بیٹے کی خدمات بھی خود بخود ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد مولوی نجم الغنی خان رام پوری اس خدمت پر مامور ہوئے چوں کہ وہ علمی اور اَدبی ماحول کے انسان تھے اس لیے وہ انتظامی امور میں بہتر ثابت نہ ہو سکے۔ جس کے باعث اس کتب خانہ کا نظام بالکل تباہ ہو گیا۔

دوسری طرف ریاست کے اکثر ملازمین اب جدید تعلیم کے پروردہ افراد تھے۔ اور انھوں نے انگریزی کتب خانوں کے ماحول کو دیکھا تھا۔ اس لیے وہ بھی اس کتب خانہ کو جدید طرزِ خاص میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ لہٰذا اس کتب خانہ میں موجود کتب کو انگریزی میں بھی مرتب کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

یہ پس منظر تھا جس میں مولانا عرشیؔ اس کتب خانے کے ناظم کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ ان کی اس ملازمت کے بارے میں دو شواہد ملتے ہیں۔ ایک عشرت رحمانی صاحب کی رائے اور دوسرا مالک رام صاحب کا نقطہ نظر ہے۔

عشرت رحمانی صاحب کے بیان کے مطابق مولانا عرشی دیگر علمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ کتب خانہ عالیہ رام پور میں نادر مخطوطات سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ کئی برسوں تک خلیفہ دوم حضرت سیّدنا عمر فاروقؓ کے خطبات و ارشادات اور خطوط کو

جمع کرتے رہے۔ اس وقت کتب خانہ عالیہ کے ناظم ایک انگریز مسٹر چمپین (Mr. Champion) تھے۔ جب موصوف نے مولانا عرشی کے ذوق علمی اور تجسس و تدقیق کی صلاحیتوں کو دیکھا تو انہیں اپنا نائب بنا لیا۔ مولانا عرشی نے اس عہدے کو اس خیال سے قبول کر لیا کہ انہیں مزید نادر مخطوطات تک رسائی آسان ہو جائے گی۔ اس پس منظر کے حوالے سے عشرت رحمانی لکھتے ہیں:

> ''جب عرشی صاحب نے مسٹر چمپین کی نیابت میں اس کتب خانہ کا جائزہ لیا..... تو ان کو اندازہ لگا کہ ان نادرات کے ذخائر بے ترتیب و بدحالی میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ چناں چہ کئی سال کی شبانہ روز جاں فشانی کے بعد ان کو درست و منظم کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ناظم اعلا مسٹر چمپین اپنے عہدے سے سبک دوش ہو کر انگلستان روانہ ہوئے تو کتاب خانہ کی نظامت عرشی صاحب کے سپرد ہوئی۔''[۴]

مولانا عرشی کی ملازمت کے بارے میں مالک رام صاحب کا بیان مندرجہ بالا رائے سے یکسر مختلف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس وقت افسرانِ بالا اس کتب خانہ کو انگریزی طریق کار کے تحت بدلنا چاہتے تھے۔ اس لیے اس وقت کے ناظم اعلا نجم الغنی صاحب کے برعکس انگریزی خواں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس مقصد کی خاطر اخبارات میں مندرجہ ذیل اشتہار دیا گیا کہ:

> ''کتاب خانہ کی جگہ کے لیے ایک مناسب شخص کی ضرورت ہے۔ جو عربی، فارسی اور انگریزی تینوں زبانیں جانتا ہو..... عرشی صاحب نے بھی اس اسامی کے لیے درخواست بھیج دی..... قصہ کوتاہ بڑی حیل و حجت کے بعد ۳۱ جولائی ۱۹۳۲ء کو ناظم اعلا کتاب خانہ مقرر ہو گئے اور آج تک اسی عہدے پر فائز ہیں۔''[۵]

مولانا عرشی نے اس اہم ذمہ داری کو سنبھالنے کے بعد دن رات ایک کر دیا۔ اور اس کتب خانہ کی ترتیب و تزئین میں جو عملی اقدامات اٹھائے اس سے والئی ریاست رضا علی

خان بھی ان کی خدمات کا بجا طور پر اعتراف کرنے لگے۔ اس طرح مولانا عرشی نے اپنے فرض کو عبادت سمجھ کر ادائیگی کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔

عقیدہ:۔

مولانا عرشی کا مذہب سے خاص لگاؤ تھا مگر ان میں شدید قسم کی مذہبیت اور قدیم الخیالی نہ تھی۔ اس لیے وہ تعصب سے کام نہ لیتے تھے۔ عقیدے کے لحاظ سے وہ اہلِ سنت والجماعت تھے۔ اور علمی و مذہبی منازل اور عقائد کے لحاظ سے امام ابو حنیفہ کے پیرو تھے۔

دوست احباب

یوں تو مولانا عرشی کا حلقہ احباب اکثر علماء و فضلاء حضرات پر مشتمل تھا لیکن مخصوص حلقہ احباب میں مولوی عزیز اللہ خان عزیز، مرزا ہادی علی واحق اور ڈاکٹر عندلیب شادانی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

عادات و اطوار:

مولانا عرشی کے خصائل میں تمام لکھنے والوں کے قلم ان کی شرافت اور خلوص کے معترف ہیں۔ ان کے مزاج میں انسانی محبت، اخوت، مروت، احترام آدمیت سب شامل ہیں۔ ذیل میں مولانا عرشی کے عادات و اطوار کے بارے میں احباب اور اہلِ ادب کی آراء پیش کی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند، مولانا عرشی کے بارے میں فرماتے ہیں:

> "مولانا امتیاز علی خان عرشی کی ذات دراصل تعلیم و تربیت کے اصول اور مشرقی قدروں کی کامیابی کا سادہ سچا مظہر اور ان کی علمی کاوشیں ان اطوار پر ایمان کا پورا اعتماد و اعلان ہیں۔"[۶]

سید عابد حسین کو جب پہلی مرتبہ مولانا عرشی کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تو اس کیفیت کی

منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"دیکھتا کیا ہوں کہ ایک کشیدہ قامت، کشادہ پیشانی، ہنس مکھ، خوش وضع، خوش قطع، مرد معقول چلے آرہے ہیں۔" ۷

اس کے علاوہ اس مردِ معقول کے ظاہری و باطنی پیکر کا جامع و مربوط مرقع جس طرح عشرت رحمانی نے پیش کیا ہے۔ وہ دوسرے تمام لکھنے والوں سے اہم ہے۔ اس سلسلے میں موصوف ظاہری و باطنی پیکر کو تراشتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تخلص کے عرشی، مزاج کے فرشی، فرشتہ صفت، نجستہ خصلت نسلی افغاق، اصل انسان، طبیعت میں لوچ اور نرمی کہ افغانی گری کا شائبہ تک نہیں۔ سادگی کا مجسمہ، اخلاص و مروت کا پیکر، مخلص و متواضع، خوش خلق، خوش اطوار، یاروں کے یار، دشمن کے لیے بے کار، علم و فضل میں واقعی مولانا، مگر شگفتہ مزاجی، زندہ دلی میں جوانِ رعنا، کشادہ پیشانی، وسیع القلب، نیک مشرب، نیک دل، تہذیب وعلوم و مشرق کے دلدادہ، زمانے کے انداز پر ہر معقول جدت قبول کرنے پر آمادہ، صورت سیرت میں حسین، ظاہر و باطن سنجیدہ متین، کم سخن مگر خوش گفتار، کم آمیز، نرم، وبے ستیز مگر علم و عمل میں تیز، اس ممتاز شخصیت کو اسم با مسمیٰ کا لقب زیب دیتا ہے۔"

اولاد:

مولانا کی ذاتی خصوصیات کو جاننے کے بعد اب اُن کی اولاد کے متعلق جاننا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مولانا عرشی کی اولاد کی پوری تفصیلات بھارت سے جناب صابر حسین صابر سنبھلی نے ایک رجسٹری میں ارسال کی تھیں لہٰذا یہ تمام خاکہ ان ہی کا عطیہ ہے۔

۱۔ **اکبر علی خان عرشی زادہ** : تاریخ ولادت ۱۸ نومبر ۱۹۳۴ء۔ ایم۔ اے فارسی (علی گڑھ) ۱۹۵۹ء۔ ڈی۔ لٹ ۱۹۶۷ء۔ رضا لائبریری میں ۱۰ دسمبر ۱۹۶۱ء سے اسسٹنٹ ڈائریکٹر، والد کی وفات کے بعد کارگزار ڈائریکٹر اکبر علی خان کی شادی ۲۸ نومبر ۱۹۶۵ء میں

مراد آباد میں ہوئی۔ موصوف محقق بھی اور شاعر بھی ہیں مگر شاعری کی طرف کم توجہ دیتے ہیں۔ عرشی زادہ کی تصانیف میں ''نکات غالب رقعات غالب'' سن اشاعت ۱۹۶۳ء۔ ''چھیڑ غالب سے چلی جائے'' سن اشاعت ۱۹۶۵ء۔ ''دیوان غالب عرشی زادہ'': ۱۹۶۹ء اور عطیہ شبلی: زیر طبع، شامل ہیں۔

عرشی زادہ کے چھ بچے ہیں۔ جن میں حسان عرشی، ولادت، ۱۹ ستمبر ۱۹۶۶ء۔ سلمان عرشی، ولادت، دسمبر ۱۹۶۷ء۔ نعمان عرشی، ولادت، دسمبر ۱۹۶۸ء۔ کیان عرشی، ولادت، جون ۱۹۷۲ء۔ سمیرا عرشی (دختر)، ولادت، جنوری ۱۹۷۶ء اور عدنان عرشی، ولادت، مارچ ۱۹۷۸ء۔

۲۔ صالحۃ الکبری (ولادت: ۱۹۳۶) مولانا عرشی کی بڑی صاحب زادی کی تعلیم مشرقی ماحول میں خانگی امور تک ہی محدود رہی۔ شادی بھی خاندان میں ۱۹۶۲ء میں ہوئی۔ ان کے پانچ بچے ہیں۔ جن میں عبید اللہ خان، اسید اللہ خان، حمیرا (لڑکی)، حمید اللہ خان اور عمید اللہ خان شامل ہیں۔

۳۔ مختار عرشی: (سال ولادت نا معلوم) ان کی تاریخ ولادت معلوم نہیں ہو سکی۔ صالحۃ الکبری سے چھوٹے اور زہرا عرشی سے بڑے ہیں۔ ان کی تعلیم درجہ ۸ تک ہی ہے اور ان کا مشغلہ کاشت کاری ہے۔

۴۔ ڈاکٹر زہرا عرشی: (عرشی صاحب کی چھوٹی صاحب زادی) ولادت ۱۹۳۹ء۔ تعلیم: ایم۔ اے۔ فارسی علی گڑھ ۱۹۷۲ء۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ علی گڑھ ۱۹۷۹ء۔

۵۔ ممتاز عرشی: ولادت: ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء۔ تعلیم: ایم۔ ایس سی (باٹنی) علی گڑھ، ۱۹۶۹ء۔

۲ فروری ۱۹۷۳ء سے گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج کے شعبہ باٹنی میں لیکچرر ہیں۔ ان کی شادی رام پور ہی میں ہوئی۔ صرف ایک بچہ ہے۔ جس کا نام حماد عرشی، ولادت ۱۹۔ اگست ۱۹۸۱ء ہے۔

۶۔ **نجف ارشاد عرشی:** ولادت ۴ جنوری ۱۹۵۱ء۔ تعلیم: ایم۔اے (عربی) علی گڑھ ۱۹۶۷ء۔

۷۔ **جعفر عرشی:** تاریخِ پیدائش معلوم نہیں ہو سکی ہے۔ البتہ نجفِ ارشاد سے چھوٹے اور راشد عرشی سے بڑے ہیں۔ ہمدرد کالج آف فارمیسی نئی دلی سے بی فارما کر چکے ہیں۔ دمِ تحریر بحرین میں ہیں۔

۸۔ **راشد عرشی:** ان کا سالِ ولادت معلوم نہیں ہو سکا۔ گورنمنٹ کالج رام پور سے اکنامکس میں ایم۔اے کیا ہے۔ بلسارا کمپنی میں ملازم ہیں۔ یہ کمپنی مچھروں سے حفاظت کا ایک مرہم تیار کرتی ہے۔

تربیت اولاد:

مولانا عرشی نے اپنی اولاد کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے حوالہ سے فرائض والدین کی جو مثال قائم کی ہے، اس کا اندازہ مذکورہ بالا خاکہ سے بخوبی ہو جاتا ہے جس میں ان کی اولاد کی پوری تفصیلات بیان کردی گئی ہیں۔ علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ مولانا کی اولاد میں اخلاقی اقدار بھی اپنے والد گرامی کے اپنے اوصاف کی مانند ہی تھیں۔ جناب نجم الدین نقوی اپنے ایک مضمون میں جس کو عرشی زادہ صاحب نے ہم تک پہنچایا ہے، مولانا عرشی کے بڑے لڑکے اکبر علی خان عرشی زادہ اور بڑی صاحب زادی زہرہ دونوں جناب نجم الدین نقوی کے شاگرد تھے۔ موصوف ان دونوں کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> ”کالج کی زندگی میں مَیں نے بہت کم ایسی بچیاں دیکھی ہیں۔ جن میں زہرہ جیسا شرم و حیا اور غیرت وحمیت کا مادہ ہو۔ دونوں بچوں کی سعادت مندی کا یہ حال ہے کہ میری وہی عزت واحترام کرتے ہیں جو زمانہ طالب علمی میں کیا کرتے تھے۔ میں لائبریری جاتا ہوں تو کبھی مولانا کے پاس یا اکبر سلمہ کے کمرے میں آجاتا ہوں تو وہ مجھے دور ہی سے دیکھ کر کرسی

سے کھڑے ہو جاتے ہیں اور میرا استقبال کرتے ہیں۔ راہ چلتے مل جاتے ہیں تو معیت ضروری سمجھتے ہیں۔ اور اس طرح کہ ایک قدم مجھ سے پیچھے ہی ٹھہرے...... ان بچوں کے تذکرے سے بھی مولانا عرشی کی عظمت پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے ان کی تربیت میں کس کس طرح اپنا رنگ بھر دیا ہے یہ بچے صحیح معنی میں اپنے باپ کا راز ہیں۔ خدا ان کی عمر اور علم میں برکت دے"۔۹

اَدبی زندگی کا آغاز:

یوں تو مولانا عرشی میں بچپن ہی سے تخلیقی صلاحیتیں موجود تھیں۔ اسی لیے تو انھوں نے اپنے بچپن کے زمانے میں ایک مقامی ڈاکو کی کہانی کو نظم کا روپ دیا تھا۔ ہر چند یہ ایک طفلانہ سا کام تھا لیکن یہ مولانا عرشی کی خداداد خوبیوں کا مظہر ضرور ہے۔ درحقیقت مولانا عرشی کی اَدبی زندگی کا سلسلہ پنجاب کے دل یعنی لاہور کی سرزمین سے شروع ہوتا ہے۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب مولانا عرشی لاہور میں مقیم تھے اور اورینٹل کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان دنوں مولانا عرشی کا یارانہ مشہور تاجر کتب شیخ مبارک علی سے تھا۔ شیخ صاحب موصوف کی دکان اُس عہد میں ایک اَدبی مرکز کی حیثیت رکھتی تھی۔ جہاں سر شام شاعر اور ادیب جمع ہوتے اور بساطِ اَدب بچھ جاتی۔ ان ہی محفلوں سے مولانا عرشی کی طبع سیراب ہوتی رہی۔ شیخ صاحب کے ایما پر مولانا عرشی نے پنجاب یونیورسٹی میں شامل تدریس بی۔ اے عربی کورس کا اُردو ترجمہ کیا۔ یہ مولانا کی پہلی اَدبی کاوش تھی۔ اس سلسلے میں اکبر علی خان عرشی زادہ لکھتے ہیں:

> "اس عنوان" اُردو ترجمہ بی۔اے۔ عربی کورس۔ از مولوی امتیاز علی خان عرشی، پنجاب یونی ورسٹی سے میرے والد کی پہلی کتاب شائع ہوئی تھی جو ایک ہزار کی تعداد میں چھپی تھی"۔۱۰

مولانا عرشی نے یہ ترجمہ بلا معاوضہ کیا تھا جو ان کی احباب نوازی کا بین ثبوت

ہے۔اس طرح مولانا نے پھر ایف۔اے کے عربی نصاب کا بھی اُردو ترجمہ کیا۔اسی طرح سے وہ اَدبی حلقوں میں روشناس ہوئے۔اس سے قبل انھوں نے چھوٹے مضامین بھی لکھنا شروع کر دیے تھے۔۱۹۲۶ء میں ان کا ایک مضمون ہندستان کے مشہور رسالے ''نیرنگ'' میں شائع ہوا جو مرزا غالب کے متعلق تھا۔اس سلسلہ میں اکبر علی عرشی زادہ ایک خط میں راقم الحروف کو لکھتے ہیں:

> ''شاید آپ کو علم نہ ہو ابا مرحوم کا پہلا مطبوعہ اَدبی مضمون غالب ہی سے متعلق ہے اس کا عنوان ہے ''خمار رسوم وقیوذ'' اور یہ رام پور کے ہندستان گیر شہرت رکھنے والے رسالہ ''نیرنگ'' میں جولائی ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا''۔"

مولانا عرشی کی اَدبی زندگی کا آغاز ''غالبیات'' سے ہی ہوا تھا۔غالبیات کے حوالہ سے گفتگو آگے آئے گی۔ذیل میں ان کی درسی کتب اور چند دیگر تصانیف ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔

درسی کتب:

مولانا عرشی نے بچوں کے لیے جس محنت اور ریاضت سے کتابیں ترجمہ کیں اس کا اندازہ اُن کتب کے مطالعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ذیل میں مولانا عرشی کی ترجمہ شدہ کتب کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

الف) راہِ ہدایت، پہلا قدم، تعداد ۱۰۰۰، کل صفحات ۶۴، کھلنا نیوز پرنٹ ایڈیشن۔

راہِ ہدایت، دوسرا قدم، تعداد ۱۰۰۰، کل صفحات ۸۰، کھلنا نیوز پرنٹ ایڈیشن۔

راہِ ہدایت، تیسرا قدم، تعداد ۱۰۰۰، کل صفحات ۹۸۔ ۷صفحات حواشی کے آخر میں ہیں۔

یہ دینیات کی تعلیم کے لیے مولانا عرشی کی وہ کتاب ہے جو بالترتیب چھٹی، ساتویں، اور آٹھویں جماعت کے طلبہ کو پڑھائی جاتی تھی۔ پہلے حصہ کا سن اشاعت ۱۹۶۰ء ہے اور یہ ایک ہزار کی تعداد میں چھپی۔اس کتاب کے ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز ہیں۔دوسرے حصہ یہ

عنوان ''دوسرا قدم'' پر سن اشاعت اور جماعت کا نام درج نہیں ہے۔ البتہ تیسرے حصہ کا سن تالیف تو نہیں ہے مگر یہ درج کر دیا گیا ہے کہ ''تیسرا قدم'' آٹھویں جماعت کے لیے تھا۔ جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا ''دوسرا قدم'' یا درمیانی اشاعت یقیناً ساتویں جماعت کے لیے ہوگی۔

ب) مرقات الادب: پہلا حصہ۔

یہ چھٹی جماعت کے لیے عربی کی تدریسی کتاب تھی۔ محکمہ تعلیم کے جدید سلیبس کے مطابق ۱۹۵۱ء میں اس کو مرتب کیا گیا۔ ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز، کشمیری بازار، لاہور۔ کل صفحات ۱۶۸۔

ج) مرقات الادب: ''تیسرا حصہ''

یہ بھی عربی کی تدریس کے لیے شامل نصاب تھی۔ اس کتاب کے بھی تین الگ الگ جماعتوں کے لیے تین حصے تھے۔ لیکن بڑی کاوش کے بعد اس کا صرف تیسرا حصہ جو آٹھویں جماعت کے طلبہ کے لیے تھا دستیاب ہو سکا ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۹۵۱ء ہے۔ کل صفحات ۲۰۰۔ ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز، کشمیری بازار، لاہور۔ طباعت نیوز پرنٹ ایڈیشن۔ تعداد ۲۰۰۰۔ قیمت: ۱۲/۳ روپے رکھی گئی تھی۔ یہ کتاب محکمہ تعلیم کی اجازت سے چھپی تھی اور گوجرانوالہ، جھنگ، لائل پور کے اضلاع میں داخل نصاب تھی۔

د) مرقاۃ العربیہ۔

یہ مڈل سکولوں کے طلبہ کے لیے عربی گرامر کی کتاب ہے۔ اس کی اشاعت بھی محکمہ تعلیم پنجاب کی اجازت سے ہوئی تھی۔ یہ گوجرانوالہ، جھنگ اور لائل پور کے اضلاع میں شامل نصاب تھی۔ سن اشاعت: ۱۴ اپریل ۱۹۵۱ء۔ کل صفحات ۲۱۹۔ ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز، کشمیری بازار، لاہور۔ طبع دوم۔ کل تعداد ۴۰۰۰ قیمت ۷۔۹۔۱ رکھی گئی تھی۔

اُردو ترجمہ۔ بی۔ اے۔ عربی کورس۔

یہ مولانا عرشی کی پہلی باقاعدہ تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی تمام عمر

نادر کتب کی تدوین میں صرف کردی تھی۔ انھوں نے دین، سیاست، شعروادب، لسانیات، غرض کوئی موضوع ہی ایسا ہوگا جس پر انھوں نے قلم نہ اُٹھایا ہو۔ عرشی زادہ صاحب کی وساطت سے جناب ضیاء الدین اصلاحی کا ایک مضمون ملا ہے۔ اس میں موصوف مولانا عرشی کی علمی اور اَدبی تصانیف کا جائزہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> ''عرشی صاحب کا موضوع غالب ہی تک محدود نہ تھا۔ وہ شعروادب، سیرو تراجم، تاریخ ومذہب اور فلسفہ ہر چیز میں برق تھے۔ ان کا اشہب قلم اُردو، فارسی اور عربی میں رواں دواں رہتا تھا۔ عربی میں ان کا مہتمم بالشان کارنامہ امام سفیان ثوری کی تفسیر کی دریافت واشاعت ہے۔ اسی کے عالمانہ مقدمہ اور محققانہ حواشی سے ان کی غیر معمولی کدوکاوش کا پتہ چلتا ہے، اس کے علاوہ بعض عربی دواوین اور ابو عبید قاسم بن سلام ہوی صاحب کتاب الاموال (م ۲۲۳) کا رسالہ اجناس بھی انھوں نے ایڈٹ کر کے شائع کیا تھا۔ فارسی میں وقائع عالم شاہی، تاریخ عالم شاہی، تاریخ محمدی اور تاریخ اکبری وغیرہ کو منظر عام پر لانے کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔
> ان کے تحقیقی کاموں میں ایک اہم چیز نادرات شاہی ہے۔ یہ خاندان مغلیہ کے آخری دور کے بادشاہ جلال الدین شاہ عالم ثانی کے فارسی، اُردو، ہندی کلام کا مجموعہ ہے۔ اس کی اشاعت سے پہلی دفعہ لوگوں کو اس مظلوم بادشاہ کی سخن سنجی اور اَدب نوازی کا علم ہوا۔ عرشی صاحب کے مقدمہ میں اس کے حالات اور شاعرانہ کمالات پر مفید گفتگو کی گئی ہے''۔[۱۲]

مولانا عرشی کی اُردو، فارسی اور عربی کتب شائع ہونے کے فوراً بعد اہلِ ذوق کے سر کا تاج بن جاتیں اور علمی واَدبی حلقے اگر ایک طرف ان کے تحقیقی کاموں پر دادِ تحسین پیش کرتے تو دوسری طرف سرکاری حکام بھی ان کی محنت پژوہی اور جگر کاوی کی حوصلہ افزائی کرتے تاکہ آئندہ بھی یہ علمی سلسلہ جاری رہ سکے۔ مولانا عرشی نے جب عربی تفسیر قرآنی ترتیب دی تو صدر جمہوریہ ہند جناب ڈاکٹر ذاکر حسین نے مولانا عرشی کی تحقیقی خدمات کا جائزہ لیتے

ہوئے کہا:

"عرشی صاحب نے متعدد دوسری اُردو، فارسی کتابیں مرتب اور شائع کی ہیں اور ان سب کا معیار اتنا بلند ہے کہ انھیں بے جھجک دنیا کے کسی دوسرے ملک کے تحقیقی کام کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں انھوں نے امام سفیان ثوری کی عربی تفسیر قرآنی مرتب کر کے شائع کی ہے۔ اس تفسیر کا واحد قلمی نسخہ بھی خود انھوں نے رضا لائبریری میں دریافت کیا اور اسے اپنے معروف اور بلند معیار سے مرتب کر کے علمی دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ میں نے جو کہا تھا کہ عالم اور ادیب معلم اخلاق ہوتا ہے تو یہ تعریف پورے طور پر عرشی صاحب پر صادق آتی ہے"۔[۱۳]

ہر چند مولانا عرشی نے تمام موضوعات پر قلم اُٹھایا اور عربی، فارسی اور اُردو کی بعض بڑی نادر کتابیں منظر عام پر پیش کیں لیکن ان کا محبوب ترین موضوع ہمیشہ غالبیات ہی رہا ہے اس لیے غالب کی تحقیق کو اپنی زندگی کا ایک خوش گوار مشغلہ سمجھ کر اس میں دل چسپی لیتے رہے اور غالب شناسی کی روایت کو استحکام بخشا۔ ایک طرف مولانا موصوف نے غالب کی کتابوں کو شائع کیا تو دوسری طرف غالب پر اپنے متفرق مقالات کے ذریعے اپنی علمی و اُدبی صلاحیتوں کا بطور غالب شناس لوہا منوایا۔ مولانا کی تصانیف بسلسلہ غالب اپنی مثال آپ ہیں۔ تو ان کے مضامین بھی اپنی جگہ تحقیق غالب میں اساسی ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔ ابھی تک دستیاب شدہ مضامین کی تعداد ۳۷ کے لگ بھگ ہے۔ بہت سے ایسے مضامین بھی ہیں جو غالباً شائع نہیں ہو سکے۔

دیگر مصروفیات:

ذیل میں مولانا عرشی کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور عملی زندگی میں ان کی مصروفیات کی ایک فہرست درج کی جا رہی ہے۔ یہ فہرست جناب صابر حسین صابر، صدر شعبہ اُردو، مرادآباد کالج نے ایک خط میں ارسال کی ہے۔ موصوف مولانا عرشی پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھ چکے ہیں۔ دیگر اہم سوانحی خاکہ

نومبر ۱۹۳۳ء میں مولانا عرشی کی شادی جورام پوری میں ہوئی۔
۱۹۳۴ء میں لائبریری کی ٹریننگ شرط سے مستثنیٰ کیے گئے۔
۱۹۵۸ء میں روس کے دورے پر بحیثیت ماہر ہندوستانیات ایک وفد کے رکن کی حیثیت میں گئے۔ پرواز ۲۔ اکتوبر کو ہوئی۔
۱۹۶۴ء میں ان کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ کی شرط ختم کردی گئی۔
۱۹۶۸ء میں یونیسکو کے تحت ہونے والے ''حفاظت مخطوطات'' کے سیمینار میں کابل میں شریک ہوئے۔ اگلے سال یعنی ۱۹۶۹ء میں پھر کابل کا دورہ کیا۔ اس بار ''یوم خوشحال خان خٹک'' کے سلسلے میں آئے تھے۔
۱۹۷۲ء کا اختتام یا ۱۹۷۳ء کے شروع میں ہاتھ میں فریکچر ہوگیا۔۱۴

اہم اداروں کی رکنیت:

مولانا عرشی اپنے حلقہ احباب میں جس قدر مقام و مرتبہ رکھتے تھے اس کا بیان محتاج وضاحت نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں علمی و ادبی انجمنیں اور حکومتی ادارے بھی فارغ نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ اس کا ثبوت جناب اکبر علی خان عرشی زادہ کی ارسال کردہ اس فہرست سے ہوتا ہے۔ جس میں مولانا عرشی کی مختلف اداروں میں رکنیت کی تفصیل درج کی ہے۔ یہاں صرف ان اداروں کے نام درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔	رکن	پبلی کیشنز بورڈ	دہلی
۲۔	رکن	اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ	بمبئی
۳۔	رکن	مجمع العربی الہندی	علی گڑھ
۴۔	رکن	اسلام اینڈ ماڈرن ایج سوسائٹی	نئی دہلی
۵۔	رکن	جامعہ اُردو	علی گڑھ
۶۔	رکن	انجمن ترقی اُردو ہند	علی گڑھ
۷۔	رکن	اُردو اکیڈمی یو۔پی۔	لکھنؤ

۸۔	رکن	دائرۃ المعارف العثمانیہ	حیدرآباد
۹۔	رکن	آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس	علی گڑھ
۱۰۔	رکن	مدرسہ مطلع العلوم	رام پور
۱۱۔	رکن	غالب صد سالہ تقریبات کمیٹی	نئی دہلی
۱۲۔	رکن	آل انڈیا اسلام اسٹڈیز کانفرنس	علی گڑھ
۱۳۔	سیکرٹری	رضا اکادمی	رام پور
۱۴۔	رکن/سیکرٹری۔ رام پور رضا لائبریری بورڈ		رام پور

اعزازات:

مندرجہ بالا خدمات کے ساتھ ساتھ ان انعامات کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو ان کی خدمات کے صلے میں اور حوصلہ افزائی کے لیے انھیں حکومت ہند یا دیگر اداروں کی طرف سے ملتے رہے۔ ان ایوارڈز کی تفصیل بھی عرشی زادہ صاحب نے یوں بیان کی ہے:۔

۱۔ رامپور۔ پبلک لائبریری کے بانی کی حیثیت سے انعام مبلغ =	۱۰۰۰ روپے	۱۹۳۶ء
۲۔ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ۔	۵۰۰۰ روپے	۱۹۶۱ء
۳۔ عربی اسکالر کے طور پر صدر ہند کی طرف سے پوری زندگی کے لیے ہر سال وظیفہ	۵۰۰۰ روپے	۱۹۷۲ء
۴۔ یو۔ پی گورنمنٹ کی طرف سے اسپیشل لائبریری انعام	۵۰۰۰ روپے	۱۹۷۴ء

اس کے علاوہ صدر ہندستان کی طرف سے ایک ''نذر عرشی'' کمیٹی بھی ۱۹۶۶ء میں تشکیل دی گئی۔

اُسلوب:

مولانا عرشی کے اُسلوب میں ان کی محنت، ریاضت، تجسس، تفحص، اور ژرف نگاہی جیسی خصوصیات کو خاص مقام حاصل ہے۔ سادگی کے ساتھ ساتھ علمیت ان کے اُسلوب کا ایک بنیادی وصف ہے لیکن اس سادگی میں شبلی کی طرح اظہارِ فضیلت کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوتا۔ ان کی سادگی حالی کی طرح سپاٹ بھی نہیں ہوتی، بل کہ خوش طبعی کی ایک باطنی اور داخلی لہر اس میں رواں دواں نظر آتی ہے۔ البتہ ان کی طبعی شرافت اور انکساری اس کا ایک جزو ضرور معلوم ہوئی ہے۔ حقائق کی جستجو میں جس آگ میں انھیں جلنا پڑا اس کی تپش وہ ہی جان سکتے ہیں۔ ان کی محنت کا اندازہ ان کی تحریروں سے لگایا جاسکتا ہے۔ غرض مولانا عرشی کے اُسلوب میں ایک طرف سنجیدگی اور متانت ہے تو دوسری طرف غالب کی خوش طبعی وظرافت بھی ہے۔ اسی لیے اپنے شاہ کار سے خود بھی محظوظ تھے اور دوسروں کو بھی مسرت وانبساط بخشتے ہیں۔ مولانا عرشی کے اُسلوب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جناب ضیاء الدین اصلاحی لکھتے ہیں:

> "مخطوطات کی تحقیق وریاضت، ان کی تلاش وجستجو اور ان کو محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ ایڈٹ کر کے شائع کرنا عرشی صاحب کا خاص امتیاز ہے۔ وہ متن کی تصحیح وتحشیہ کے کام سے اس وقت تک مطمئن نہ ہوتے جب تک ان کے تمام نسخوں کو ملاحظہ نہ کر لیتے۔ اس کے لیے ان جگہوں کا سفر کرتے جہاں ان کے نسخے موجود ہوتے یا ان کی نقلیں مہیا کرتے۔ ان کی تحریر میں عالمانہ وقار وسنجیدگی کے ساتھ ہی سادگی، سلامت روی اور دلآویزی ہوتی تھی۔"[۱۵]

وفات:

علم وادب کی یہ دلدادہ شخصیت بشریت کے آخری تقاضے پورے کرنے کے لیے اس جہانِ رنگ وبو کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اَدب کی دنیا کو سوگوار کر گئی۔ مولانا عرشی

کی تاریخ وفات اور تدفین کے بارے میں ان کے فرزند دل بند اکبر علی خان عرشی زادہ بیان کرتے ہیں:

"وقت انتقال شب ڈھائی بجے ۲۴ اور ۲۵ فروری ۱۹۸۱ء کی درمیانی شب، تدفین بھی مابین عصر و مغرب ہوئی۔ رضا لائبریری کے مغربی گوشے میں...... اور تدفین میں اتنے لوگوں نے شرکت کی کہ دیکھنے والوں نے اس سے پہلے اتنا اجتماع (نوابان رام پور کے جنازے کے علاوہ) کبھی نہیں دیکھا تھا۔"[۱۰]

....

حواشی

۱۔ مکتوب: بنام راقم الحروف مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۸۳ء۔

۲۔ مالک رام: نذر عرشی، ص ۲۴، ۲۵، مرتبہ: مالک رام اور مختار الدین احمد، مطبوعہ: جمال پرنٹنگ پریس، دہلی نمبر ۲، ۱۹۶۵ء۔

۳۔ نذر عرشی۔ مرتبہ: مالک رام اور مختار الدین احمد، ص ۲۷ بار اول ۱۹۶۵ء۔ مطبوعہ جمال پرنٹنگ پریس، دہلی نمبر ۲۔

۴۔ عشرت رحمانی، نقوش شخصیات نمبر، اکتوبر ۱۹۵۶ء، لاہور

۵۔ نذر عرشی، ص ۲۸ طبع اول ۱۹۶۵ء۔

۶۔ اقتباس از مضمون۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند: مراسلہ عرشی زادہ، نومبر ۱۹۸۳ء۔

۷۔ نذر عرشی: ص ۶۳ طبع اول، ۱۹۶۵ء۔

۸۔ عشرت رحمانی، نقوش، شخصیات نمبر، اکتوبر ۱۹۶۵ء، لکھنؤ۔

۹۔ نجم الدین نقوی: اقتباس از مضمون، ص ۹۔ مرسلہ عرشی زادہ بنام راقم الحروف، ۱۳، نومبر ۱۹۸۳ء۔

۱۰۔ اکبر علی خان عرشی زادہ کا خط راقم الحروف کے نام: مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۸۳ء۔

۱۱۔ عرشی زادہ کا مکتوب بنام راقم الحروف مورخہ ۲۷۔ مئی ۱۹۸۳ء۔

۱۲۔ مضمون نگار۔ ضیاء الدین اصلاحی۔ ص ۴، ۵۔ بحوالہ اکبر علی خان عرشی زادہ۔ مورخہ: تاریخ درج نہیں ہے۔ موصول نومبر ۱۹۸۳ء۔

۱۳۔ اقتباس از "مضمون، مرقومہ صدر جمہوریہ ہند جناب ڈاکٹر ذاکر حسین ص ۴، مرسلہ عرشی زادہ۔

۱۴۔ جناب صابر حسین صابر۔ خط بنام راقم الحروف مورخہ یکم اگست ۱۹۸۳ء۔

۱۵۔ جناب ضیاء الدین اصلاحی۔ اقتباس از مضمون۔ مرسلہ جناب عرشی زادہ مورخہ نومبر ۱۹۸۳ء۔

۱۶۔ عرشی زادہ: خط بنام راقم الحروف۔ مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۸۳ء۔

◆◆◆

دوسرا باب

مطالعہ غالب کی روایت اور مولانا عرشیؔ

◆◆

غالب کے محققین اور ناقدین کی اس رائے سے قطع نظر کہ غالب اپنے عہد سے رنجیدہ خاطر اور ہمیشہ ناآسودہ رہے، خود کلامِ غالب اور خطوط غالب میں اس امر کی طرف جابجا اشارے موجود ہیں، مثلاً:

جو چاہیے نہیں وہ میری قدر و منزلت
میں یوسف بہ قیمت اول خریدہ ہوں
ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشنِ ناآفریدہ ہوں

یہاں پہلے شعر میں واضح اشارہ ''جو چاہیے'' پہ ہے ''قدر و منزلت'' ہونے کا اعتراف تو کیا ہے مگر یہ حیثیت کے مطابق نہیں ہے۔ اس لیے تو ان کی دوررس نگاہ ''گلشنِ ناآفریدہ'' کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اپنے عہد سے ناقدری کے اس موقف کے برعکس اگر غالب کے حلقۂ احباب پر ایک سرسری نظر دوڑائیں تو ہمیں مفتی صدرالدین آزردہ، مولوی فضل حق خیرآبادی، نواب ضیاء الدین خان نیر رخشاں، مولوی عبداللہ خان علوی، امام بخش صہبائی، مومن خان مومن، سید غلام حسین خان وحشت، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ اور مولانا حالی جیسی عالم و فاضل اور یکتائے روزگار شخصیات نظر آئیں گی۔ یہ سب اکابرین فن اور صاحبانِ علم و فن غالب سے ربط ضبط قائم رکھنے اور غالب کے حضور دیوان خانے میں باہم مل بیٹھنے کو رفاقت شہنشاہ سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ ممکن ہے عوام الناس کے حلقے میں غالب کی وہ حوصلہ

افزائی نہ ہوئی ہو جس کے وہ متقاضی اور حق دار بھی تھے۔ غالب کی اپنے عہد میں مقبولیت اور اہمیت کے حوالے سے ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں:

"یہ بات سرے سے غلط ہے کہ اپنے زمانے میں غالب کی قدر نہ تھی......
غالب سے بڑا عہد آفریں کوئی نہیں پیدا ہوا۔" [۱]

غالب کے آغازِ شعر گوئی اور ان کی مقبولیت کے حوالے سے دیکھا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ اپنے ابتدائی دور سے ہی کلام غالب لوگوں کے لیے عجوبہ روزگار تھا۔ خدائے سخن میر تقی میر کے خراجِ تحسین سے لے کر غالب کے معاصر تذکروں، اخبارات، شعرا کے بیانات اور ان کے فنی کمالات پر تقریظیں، بجائے خود گواہ ہیں کہ جیتے جی غالب کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ غالب شناسی کی روایت کے ابتدائی امین یہی تذکرے ہی ہیں اور تذکروں کی یہ زنجیر آبِ حیات تک پھیلتی ہے۔ ان کے بعد انیسویں صدی کے آخر میں مولانا حالی کی ایک شریف انسان کی دوسرے شریف انسان کے بارے میں سوانح عمری، "یادگارِ غالب" اس روایت کو ایک قدم اور آگے لے جاتی ہے۔ بعد ازاں بیسویں صدی کے شروع سے اس روایت کو استحکام دیوان غالب کی شرحوں سے ملتا ہے۔ تاہم اسی دوران عبدالرحمٰن بجنوری کا ایک نعرہ مستانہ غالب شناسی کے رجحان کو غالب پرستی کے مقام پر لے جاتا ہے۔ بجنوری کے نعرہ کی صدائے بازگشت میں ڈاکٹر عبداللطیف کی آواز بھی شامل ہو جاتی ہے۔ جس سے غالب پرستی کے بجائے اس روایت میں منطقی، استدلالی اور غیر جذباتی پہلو مطالعہ غالب کی اہمیت بڑھا دیتا ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل سے تفہیم غالب کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ غالب اُردو ادب کا مستقل موضوع بن گئے۔ اس حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر چند انھیں اپنے عہد میں ناقدری کی شکایت رہی ہو لیکن اس کی تلافی بعد کی نسل نے ضرور کر دی ہے گویا اب روحِ غالب ایک طرح سے آسودہ خاطر اور مطمئن ضرور ہو گی۔

آغازِ شعر گوئی:

مطالعہ غالب کی اس روایت کے اجمال کی تفصیل جاننے سے قبل مناسب ہے کہ غالب کے آغازِ شعر گوئی کے بارے میں جان لیا جائے۔ اس ضمن میں غالب کا ایک بیان ہے:

"بارہ برس کی عمر سے نظم و نثر میں کاغذ مانند اپنے نامہ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔ باسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے۔"[۲]

باسٹھ برس کی عمر میں غالب نے اس شیوے کی ورزش کا عرصہ پچاس برس بتایا ہے۔ گویا بارہ برس کی عمر سے وہ میدانِ سخن میں قلم کے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کا بیان ہے کہ غالب نے آغازِ شاعری کے بارے میں جتنے متضاد بیانات دیے ہیں ان سے کوئی حتمی فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔"[۳]

غالب کے پہلے سوانح نگار مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں لکھا ہے کہ مرزا کی شاعری، اکتسابی نہ تھی بل کہ یہ ملکہ انھیں قدرتی اور فطری طور پر ودیعت ہوا تھا۔ اس طرح یہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ غالب نے بالکل اوائل عمری میں شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ تاہم مولانا حالی نے گیارہ برس کے سن کو زمانہ آغاز قرار دیا ہے۔ جس کو انھوں نے دیوانِ غالب فارسی سے ثابت کیا ہے۔ مولانا عرشی بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ البتہ انھوں نے دس اور بارہ برس کا تعین کیا ہے۔ غالب کے تقریباً تمام نقاد اسی زمانہ یعنی دس اور گیارہ برس کو آغازِ شعر گوئی کا زمانہ قرار دیتے ہیں۔

غالب شناسی کے اولین نقوش بزبانِ میر:

غالب کی منفرد اور جدت پسند طبع کی طرح یہ پہلو بھی منفرد اور حیران کن ہے کہ جس وقت مرزا کی شاعری کا آغاز ہوتا ہے اسی زمانہ سے اس کی تنقید کی عمارت میں پہلی اینٹ بھی خدائے سخن میر تقی میر جیسی شخصیت کے ہاتھوں رکھی جاتی ہے۔ اُستادِ سخن میر تقی میر نے کہا تھا کہ: ع مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔

غالب کے پہلے نقاد میر ہی بتائے جاتے ہیں۔ مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں لکھا ہے کہ غالب کے بچپن کے دوست نواب حسام الدین جب مرزا کے اشعار میر تقی میر کو دکھاتے ہیں یہ میر کی عمر کا آخری زمانہ تھا۔ میر ان اشعار کو سننے کے بعد اپنی رائے دیتے ہیں کہ:

> "اگر اس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا اور اُس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل لکھنے لگے گا۔"[۴]

میر کا یہ بیان ان کی ژرف نگاہی کا ثبوت ہے۔ وہ لڑکا لاجواب شاعر ہی بن کر اُبھرا۔ اس وقت میر عمر کے آخری ایام میں تھے۔ جب انھوں نے مذکورہ رائے دی تھی۔ ۱۸۱۰ء میں میر کا انتقال ہوتا ہے۔ جس وقت غالب کی عمر تیرہ برس تھی۔ گویا غالب کو شعر گوئی کے ایک ڈیڑھ برس بعد ہی میر سا نقاد میسر آیا۔

مولانا حالی کے اس بیان کردہ واقعہ کے بارے میں بھی نقادوں کی مختلف رائے ہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے حالی کی اس حکایت سے اختلاف کیا ہے۔ مولانا مہر اس سلسلے میں کہتے ہیں:

> "اس کم عمری میں مرزا کا کلام آگرے سے لکھنؤ پہنچا کیسے اور اسے وہاں کون لے گیا اور پھر اس کی ضرورت ہی کیوں محسوس کی گئی؟"
> میر اپنی عمر کے آخری دو تین برس مختل الحواس رہے اور چوں کہ ان کے یہ ایام وراقنگی حواس اور ہجوم امراض میں گزرے اس لیے وہ کوئی رائے ظاہر کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔[۵]

مولانا غلام رسول مہر کے برعکس وہ نقاد ہیں جنھوں نے مولانا حالی کی اس رائے کو درست تسلیم کیا ہے۔ ان میں مالک رام اور فرمان فتح پوری سرِفہرست ہیں۔ مولانا مہر کے دلائل کا معقول جواب مالک رام نے ذکرِ غالب میں دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

> "یہ استدلال بہت کمزور ہے یہ کس نے کہا کہ کلام ضرور آگرہ سے گیا۔ مرزا کے تعلقات نواب احمد بخش خان کے خاندان سے معلوم ہی ہیں۔ وہ

سات برس کی عمر سے دہلی آتے جاتے رہے اور ان ایام میں وہ لازماً نواب صاحب کے یہاں ٹھہرتے ہوں گے، نواب صاحب کے چھوٹے بھائی الٰہی بخش معروف بہت اچھے شاعر تھے۔ ناممکن ہے کہ انھوں نے مرزا کا یہ ابتدائی کلام نہ سنا ہو۔ نواب حسام الدین حیدر خان نامی اور معروف کے گہرے تعلقات مہر صاحب کو تسلیم ہیں۔ نامی نے یہیں مرزا کا کلام دہلی میں خود مرزا سے لیا یا معروف سے اور اس کی ندرت اور غرابت کے پیش نظر اسے لے جا کے لکھنؤ میں اپنے اُستاد میر کو دکھایا کہ دیکھیے حضرت ایک بارہ تیرہ برس کا لڑکا ایسے شعر کہتا ہے۔"[۶]

مولانا مہر کے دوسرے سوال کے جواب میں مالک رام کا موقف ہے کہ:

"میر کتنے ہی پریشان اور وارفتہ رہیں شعر سننے سے تو نہیں گئے تھے۔ اور اپنی رائے کا اظہار ہی نہ کر سکتے۔ وہ کوئی تنقیدی مضمون تو نہیں لکھ رہے تھے، کہ خیالات کو ترتیب دیتے اور قلم پکڑتے۔ انھوں نے نامی سے کچھ شعر سنے اور اپنی رائے ایک آدھ فقرے میں ظاہر کر دی۔"[۷]

مالک رام کے خیالات کی تائید کرنے والے ناقدین میں جناب فرمان فتح پوری اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"مالک رام کی بات دل کو لگتی ہے۔ اول اس لیے کہ میر تقی میر کی پیش گوئی کے سلسلے میں مولانا حالی جیسے نیک نفس، اور ثقہ بزرگ کے جھوٹ بولنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ دوسرے اس سبب سے کہ غالب فی الواقع بہت کم عمری سے شعر کہنے لگے تھے۔ ان کے کلام نے بہت جلد اعتبار حاصل کر لیا تھا۔"[۸]

مالک رام اور فرمان فتح پوری کے بیانات کے ساتھ ساتھ غالب کے وہ الفاظ جن میں انھوں نے بارہ برس سے اس شیوے کی ورزش کو بیان کیا، مدنظر رکھا جائے تو مولانا حالی کی روایت کی صحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا بلکہ میر کے الفاظ کو اُستاد کا خراج تحسین تصور کرنا چاہیے۔

میر تقی میر کے الفاظ کے بعد غالب شناسی کی روایت میں دوسری اہم کڑی غالب کے عزیز اور اپنے عہد کے مشہور عالم اور صاحب کمال وفن نیز ماہرِ فن تقریظ نگاری، نواب ضیاءالدین احمد خان نیر رخشاں کی شخصیت ہے۔ نواب موصوف نے غالب کا تعارف تنقیدی انداز میں سب سے پہلے کرایا ہے۔ نیر رخشاں کی یہ تنقید ان کی اس تقریظ کی صورت میں ہے جو انھوں نے ۱۸۴۱ء میں چھپنے والے پہلے دیوان غالب کے لیے لکھی تھی۔ اس سلسلے میں فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> "میر کی پیش گوئی سے قطع نظر ایک جامع تقریظ کی صورت میں غالب کا اولین تعارف ...... نواب ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں نے کرایا ہے۔"[۹]

نیر رخشاں کی لکھی ہوئی یہ تقریظ ۱۸۳۸ء میں مکمل ہوئی۔ چوں کہ دیوان ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا۔ اس لیے بعد میں اس تقریظ میں بھی اضافہ کیا گیا۔ دیوان غالب کی پہلی اشاعت مطبع سید الاخبار، دہلی سے اس تقریظ کے ساتھ ہی ہوئی۔ بعد ازاں یہی تقریظ سر سید احمد خان کی مشہور تصنیف، آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن میں بھی شامل کر لی گئی۔

تذکروں میں غالب کا تذکرہ:

اُردو ادب کا قدیم تنقیدی و تحقیقی ورثہ تذکرہ نگاری کی صورت میں ہے۔ چناں چہ مطالعہ غالب کی روایت بھی اپنے ابتدائی دور میں اس تذکرہ نویسی کی مرہونِ منت ہے۔ تذکروں میں غالب کے تذکرے کو دیکھنے سے قبل تذکرہ نگاری کا مفہوم جان لینا ضروری ہے۔ تذکرہ نگاری قدیم فن تنقید کی ایک شکل ہے، ماضی کے تمام شعرا، ان کے کلام اور محاسنِ شعری سے آج ہم ان ہی تذکروں کی مدد سے آشنا ہوئے ہیں۔ تذکرہ نگاران صاحب ذوق حضرات کو کہا جا سکتا ہے جو اپنے پسندیدہ شعرا، کا کلام ایک بیاض میں جمع کر لیتے پھر بعد میں انتخاب کلام کے ساتھ ساتھ نیم تاریخی، نیم تنقیدی اور نیم سوانحی سی فضا قائم کر لیتے تھے۔ جسے تذکرہ کہا جانے لگا۔ گویا تذکرہ تاریخ، تنقید اور سوانح جیسے تین رنگوں کا ایک آمیزہ

ہوتا تھا۔ حقیقت میں اس تذکرہ نگاری کے فن کو ادبی تاریخ کا اولین نمونہ کہنا چاہیے۔

دوسرے شعری عناصر کی طرح تذکرہ نگاری کا فن بھی اُردو میں فارسی کی وساطت سے آیا ہے۔ جس سے یہ فن ایک عرصہ تک فارسی کے زیرِ اثر ہی رہا اور اس کے ہاتھوں پروان چڑھا۔ تحقیق کے مطابق ۱۷۵۳ء میں ''نکات الشعرا'' سے لے کر ۱۸۸۰ء میں ''آبِ حیات'' تک کل ۵۴ تذکرے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان دستیاب شدہ تذکروں میں سے ۱۴ غالب کی ولادت سے قبل اور ۱۸ ان کی وفات کے بعد تالیف ہوئے۔ ان میں سے بائیس (۲۲) تذکرے ایسے ہیں جن میں غالب کا ذکر موجود ہے۔ البتہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحقیق کے مطابق غالب کے ذکر والے تذکرے چوبیس ہیں۔

ان تذکروں کے حوالہ سے مطالعہ غالب کی روایت سے آگہی کے لیے چند نمائندہ تذکروں میں غالب کے بارے میں ان کے مصنفین کے خیالات کا مطالعہ اساسی ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ عیار الشعراء	۱۷۹۸ء	خوب چند ذکا
۲۔ عمدہ منتخبہ	۱۸۰۱ء	میر محمد حسین خان سرور
۳۔ گلشن بے خار	۱۸۳۴ء	نواب مصطفیٰ خان شیفتہ
۴۔ گلشن بے خزاں	۱۸۴۵ء	قطب الدین باطن
۵۔ طبقات الشعراء	۱۸۴۶ء	منشی کریم الدین
۶۔ آثار الصنادید	۱۸۴۷ء	سر سید احمد خان
۷۔ گلستان سخن	۱۸۵۵ء	مرزا قادر بخش صابر
۸۔ طور کلیم	۱۸۷۸ء	سید نور الحسن خان
۹۔ انتخاب یادگار	۱۸۷۹ء	امیر مینائی
۱۰۔ آب حیات	۱۸۸۰ء	محمد حسین آزاد
۱۱۔ تذکرہ جلوۂ خضر	۱۸۸۴ء	سید فرزند احمد صفیر بلگرامی

مندرجہ بالا ان گیارہ تذکروں میں بھی اہم ترین تین تذکرے شیفتہ کا "گلشن بے خار" سرسید احمد خان کا آثار الصنادید اور محمد حسین آزاد کی آب حیات ہیں۔ ان کی ایک اہمیت تو تنقیدی اعتبار سے بھی ہے اور دوسری یہ اُردو ادب کی اہم ترین شخصیات کا علمی و اَدبی سرمایہ ہیں۔

ا۔ عیار الشعراء:

غالباً دستیاب شدہ تذکروں میں یہ پہلا تذکرہ ہے۔ جس میں غالب کے بارے میں مواد موجود ہے۔ اس کے سن تالیف کے بارے میں مختلف آرا ملتی ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس کے سنین کا تعین ۱۲۰۸ھ اور ۱۲۷۴ھ کے درمیان کیا ہے۔ اور شعراء کی تعداد ۱۵۰ بتائی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۱۲۱۳ھ/ ۱۷۹۸ء کو آغاز اور ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء کے قریب خاتمہ تصور کرتے ہیں۔ خوب چند ذکا کے اس تذکرے میں غالب کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

> "مرزا اسداللہ خان غالب۔ عرف مرزا نوشا المتخلص بہ غالب۔ ولد مرزا عبداللہ خان عرف مرزا دولہ نبیرہ مرزا غلام حسین کمیدان ساکن بلدہ اکبر آباد، شاگرد مولوی معظم شاعر فارسی و ہندی است از دست"۔[۱۰]

خوب چند ذکا کے تذکرے میں خاص بات یہ ہے کہ اس میں کلامِ غالب کے وہ ابتدائی نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ جن سے غالب کے شعری ارتقاء کو سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً:

صبا لگا وہ طمانچے، طرف سے بلبل کے
کہ روئے غنچہ گل، سوئے آشیان پھر جائے
زخم دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے
اپنے ہنستے کو رُلایا ہے کہ جی جانے ہے

مندرجہ بالا دونوں اشعار صرف اسی تذکرے کی وجہ سے آج ہماری معلومات کا حصہ ہیں۔

اسی طرح اس تذکرے میں بعض اشعار ایسے بھی ہیں جو "نسخہ حمیدیہ" کے علاوہ

کسی اور متداول نسخہ میں موجود نہیں ہیں۔ مثلاً :

نہ بھولا اضطراب دم شماری انتظار اپنا
کہ آخر شیشہ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

متداول دیوان کی مقبول و معروف یہ غزل بھی موجود ہے

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد!

۲۔ عمدہ منتخبہ :

دوسرا تذکرہ جس میں غالب کا ذکر موجود ہے۔ وہ اعظم الدولہ میر محمد حسین خان سرور کا عمدہ منتخبہ ہے۔ بعض نقاد اس تذکرے کو خوب چند ذکا کے "عیار الشعراء" پر مقدم تصور کرتے ہیں۔ یہ تذکرہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے ۱۹۶۱ء میں لندن کے قلمی نسخے کی مدد سے دہلی یونیورسٹی سے شائع کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق اس کی تالیف کا آغاز ۱۲۱۵/۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۰ء/۱۸۰۱ء ہوا اور اس کا خاتمہ ۱۸۰۹ء کو ہوا۔

مخطوطات انجمن ترقی اردو، کراچی کے مطابق ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء اس کے پہلے مسودے کی تکمیل کا زمانہ ہے لیکن بعد میں سات آٹھ سال تک اس میں برابر اضافے ہوتے رہے۔ اس طرح یہ تذکرہ ۱۲۱۵ھ اور ۱۲۳۲ھ کی درمیانی مدت میں تالیف کیا گیا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ان دونوں کے تقدم کا ذکر کرتے ہوئے ایک کو آغاز کے لحاظ سے اور دوسرے کو اختتام کے لحاظ سے مقدم قرار دیتے ہیں بایں ہمہ ان دونوں تذکروں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ سرور اپنے اس تذکرے میں غالب کے بارے میں تنقیدی خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> "اسد تخلص، اسد اللہ خان نام، عرف مرزا نوشہ۔ آبا ؤ اجداد کا وطن سمرقند، مستقر الخلافہ اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ قابل، یار باش اور دردمند جوان ہیں...... خاطر میں ریختہ گوئی کا ذوق متمکن ہے۔ فن سخن سنجی میں میرزا عبدالقادر بیدل علیہ الرحمہ کے محاوروں کا اتباع کرتے ہیں اور ریختہ

محاورات فارسی میں موزوں کرتے ہیں..... ان کے اکثر اشعار نازک
مضامین کے ساتھ زمین سنگلاخ میں موزوں ہوئے ہیں۔"[۱۱]

اوّل الذکر خوب چند ذکا کے تذکرے کی طرح سرور کے اس تذکرے کی اہمیت بھی کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس میں بھی بعض اشعار ایسے ہیں جو اور دواوین میں نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ نسخۂ حمیدیہ میں بھی نہیں پائے جاتے۔ تاہم مولانا عرشی اور مالک رام نے انھیں یہیں سے اپنے مدونہ دواوین میں شامل کرلیا ہے:

بجلی کے کڑکنے کا ہوں قربان
شب چھاتی سے لگ گئے وہ ڈر کر
رہتے ہیں آئینہ سے ہمیشہ وہ چار آپ
تنہا ہی لوٹتے ہیں یہ ساری بہار آپ
شمشیر صاف یار جو زہر دادہ ہو
وہ خط سبز ہے کہ بہ رخسار سادہ ہو
دیکھتا ہوں اسے تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں خواب زلیخا مجھ کو
ماہِ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے

....

۳: گلشن بے خار:

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا یہ تذکرہ غالب شناسی کی ابتدائی روایت میں خاص اہمیت وانفرادیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ غالب کے نزدیک کسی شاعر کے کلام کے لیے اس سے زیادہ قدر ومنزلت کی ضرورت نہیں کہ شیفتہ سا صاحب ذوق اُسے پسند کرے۔ گویا شیفتہ کی داد غالب کے لیے حاصل کلام ہوئی۔ اپنے عہد میں غالب بھی خواص کے شاعر تھے

اور شیفتہ بھی طبقہ خواص کو ہی شاعری کا نمائندہ قرار دیتے تھے۔ شیفتہ اور غالب کے ذہنی قرب کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

"شیفتہ غالب کے پہلے نقاد ہیں۔ جن کا شعری شعور غالب کے تخلیقی عمل میں بھی کسی حد تک کارفرما نظر آتا ہے۔" ۱۲

شیفتہ نے تعصب سے بالاتر ہو کر غالب کے سلسلے میں بے لاگ رائے کا اظہار کیا ہے جہاں غالب کی شاعرانہ خصوصیات بیان کر دی ہیں وہیں فارسی کے مستند اساتذہ سے بھی موازنہ کیا ہے۔ اساتذہ فارسی کے ساتھ تقابل کی ایک مثال پیش ہے:

"غزلش چون غزل نظیری بے نظیر و قصیدہ اش چون قصیدہ عرفی دل پذیر"۔ ۱۳

اس تذکرے میں تقابلی پہلو کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

"شیفتہ کے گلشن بے خار میں جو تقابلی پہلو نمایاں ہے وہ زیادہ اہم ہے کیوں کہ اس میں زیادہ تفصیل اور گہرائی پائی جاتی ہے"۔ ۱۴

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مندرجات کے مطابق شیفتہ نے ۱۲۴۸ھ/ جون ۱۸۳۲ء میں اس کی تالیف کا آغاز کیا اور دو سال کی مدت میں ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۵ء میں اس کو ختم کیا لیکن یہ پہلی بار ۱۲۵۲ھ/ ۱۸۳۷ء میں مطبع دہلی اُردو اخبار سے مولوی محمد باقر کے زیر اہتمام چھپا۔ اس میں غالب کا ذکر کرتے ہوئے شیفتہ لکھتے ہیں:

"چمن معنی کے طول بلند پرواز اور گلشن رنگین بیانی کے بلبل نغمہ پرداز، آپ کی بلند خیالی کے مقابلے میں بلند آسمان پست از زمین ہے۔ اور ان کی گہرائی فکر کے سامنے قارون کرسی نشین ہے...... شروع شروع میں اپنی دشوار پسند طبیعت کی بنا پر مرزا بیدل، کے رنگ میں وقت آفرینیاں کیں آخر یہ رنگ چھوڑا اور دوسرا پسندیدہ رخ اختیار کیا (دیوان کے ذکر میں لکھتے ہیں)...... اس میں سے بہت سے اشعار کو نکال دیا اور تھوڑا حصہ انتخاب کیا۔" ۱۵

۴۔ گلدستۂ نازنیناں:

مطالعہ غالب کی روایت میں اس تذکرے کا بھی ایک اہم کردار ہے۔اس کے مولف کریم الدین ہیں اور یہ ماہ ذی الحجہ ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء میں تمام ہوا۔اور ماہ صفر ۱۲۶۱ھ / فروری ۱۸۴۵ء میں چھپنا شروع ہوا۔چناں چہ مطبع سلطانی، دہلی سے اسی سال یعنی ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا۔غالب کا ذکر کرتے ہوئے مولف لکھتے ہیں:

> "ادیب لبیب اس مرتبے کے ہیں کہ سحبان ابن وائل مقابل اوج بلند خیالی ان کے حضیض جہل کا مبتلا، مشہور سخن فہم و مشہور سخن دان...... صاحب دیوان و تصانیف ہیں مگر مدت سے فکر ریختہ گوئی زبان اُردو کا ترک کیا۔"[۲۰]

اس تذکرے کی انفرادیت اس میں شامل کلام غالب کا طویل انتخاب ہے۔اس سے قبل کسی اور تذکرے میں اتنا طویل انتخاب پیش نہیں کیا گیا،اس کے علاوہ دوسرے دواوین سے یکسر الگ ایک غزل کا بھی اس میں اضافہ ہے۔اس کے تین اشعار پیش ہیں:

اپنا احوال دل زار کہوں یا نہ کہوں
ہے حیا مانع اظہار کہوں یا نہ کہوں

اپنے دل ہی سے میں احوال گرفتاری دل
جب نہ پاؤں کوئی غم خوار کہوں یا نہ کہوں

آپ سے وہ میرا احوال نہ پوچھے تو اسد
حسب حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں

۵۔ آثار الصنادید:

غالب شناسی کی روایت میں ایک اہم حصہ سرسید کی اس شہرہ آفاق تصنیف کا بھی ہے سرسید غالب کی نثری خصوصیات کو مشعل راہ بنا کر آسان اُردو نثر کے بانی کہلائے۔تاہم جب سرسید کی اس تصنیف کے پہلے ایڈیشن پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سرسید قدیم اُسلوب عبارت کے جال میں بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔آثار الصنادید پہلی مرتبہ

۱۸۴۶ء میں مطبع سید الاخبار سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ اس کی تقریظ غالب نے اپنے ہاتھوں سے لکھی نیز کتاب کے چھپ جانے کے بعد دوست اور احباب کو اس کی اہمیت کا احساس بھی دلایا۔ اس کے چوتھے باب میں مشاہیر دہلی کا ذکر ہے۔ جس میں سب سے پہلا تذکرہ غالب کا ہی ہے۔ بعض حضرات کی رائے ہے کہ یہ میرزا کے حالات و واقعات سے متعلق پہلی باقاعدہ کتاب ہے۔ چناں چہ رشید احمد صدیقی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "سر سید کی کتاب آثار الصنادید سب سے پہلی کتاب ہے، جس میں غالب کے حالات وکلام پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔"[۱۷]

سترہ صفحات پر غالب کے متعلق بہت مفصل اور جامع انداز میں سوانحی اور تنقیدی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ بایں ہمہ یہ عبارت لکھنوی اُسلوب نگارش کا نمونہ معلوم ہوتی ہے۔ اسے مقفیٰ اور مسجع عبارت کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ سر سید کے اولین اُسلوب نگارش کا بھی یہ بہترین عکس ہے۔ تاہم غالب کے سلسلے میں سر سید نے قدرے مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ جس سے ایک طرح کی یک رنگی کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ گویا اسے تنقید کا سلجھا اور منجھا ہوا انداز بھی نہیں کہا جا سکتا۔ غالب کی خصوصیات اور اہمیت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "خسرو اس بادشاہ سخن کے آگے سرگرم خدمت ملاحت کلام سعدی ان کے خوان فیض کی نمک خوار شیرنی زبان حافظ ان کی نعت مقال سے روزینہ دار، رنگینی معنی سے صفحہ کو گل رنگ اور طراحی فکر سے کاغذ کو اورنگ کرنا خاصہ اسی چمن طراز سخن وری اور نقاش صحیفہ ہنر پروری کا ہے۔ اگر الفاظ ثقیل سے گرانی اٹھائے تو کوہ کاہ کا حکم پیدا کرے اور اگر سخن میں متانت صرف کرے تو ورق بیاض صدمہ صرصر سے جگہ نہ ہے۔ قلم ان کا معنی روشن کی تراوش سے فوارۂ نور اور عبارت پاکیزہ ان کی لطف وکیفیت سے شراب انگور۔ اگر اس سخن طراز کمال کے استعداد جو طرف حصر وشمار سے افزوں ہے، خامہ دو زبان بیان کرے اول چاہیے کہ ملکہ عقل و فعال

سے عاریت مانگے اور زبان قلم تقدیر سے مستعار لے۔"۱۸

مندرجہ بالا اقتباس کے ایک ایک حرف میں عقیدت کا اظہار نمایاں ہے۔ پھر تشبیہ و استعارہ کی بھرمار نے بھی بات کو پیچیدار بنا دیا ہے۔

سرسید کے آثار الصنادید کے بعد بھی بہت سے تذکرے منظر عام پر آتے رہے ان سب کا تفصیلی تجزیہ اس مختصر باب میں ممکن نہیں، البتہ ان میں ۱۸۷۵ء کا چھپا ہوا قطب الدین باطن کا تذکرہ گلستان بے خزاں ہے۔ اس کی تالیف کا زمانہ ۱۸۴۵ء کے لگ بھگ ہے۔ یہ مطبع نول کشور سے پہلی بار چھپا۔ اس تذکرے کی اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ شیفتہ کے تذکرے گلشن بے خار کے جواب میں لکھا گیا۔ شیفتہ چوں کہ شعرا کے طبقہ خواص کے مداح تھے، اس لیے ان ہی کے کلام کو سند جانتے وہ نظیر اکبر آبادی جیسے عوامی شاعر کو مستند شاعروں کی صف سے خارج کر دیتے ہیں، چناں چہ شیفتہ کے ردعمل کے طور پر نظیر اکبر آبادی کے خوشہ چین باطن نے شیفتہ کے تذکرے کے جواب میں یہ تذکرہ لکھا۔ اس میں غالب اور شیفتہ کے دوسرے پسندیدہ شاعروں کو ہدف تنقید بنایا گیا۔ باطن کا یہ تذکرہ غالب پر تنقید کا پہلا پتھر ثابت ہوتا ہے۔

اس طرح ایک اور تذکرہ امیر مینائی کا انتخاب یادگار ہے۔ یہ پہلی بار ۱۸۷۹ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں تنقید کی ایک عمدہ جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ نیز فن کارانہ انداز میں کلام کی خوبیوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ تذکروں کے اس سلسلے کی اہم اور آخری کڑی مولانا محمد حسین آزاد کے تذکرے آب حیات کو تصور کرنا چاہیے۔

۶۔ آب حیات :

تذکروں سے مطالعہ غالب کی جس روایت کا آغاز ہوا تھا وہ سلسلہ غالب کی وفات کے بعد بھی جاری رہا۔ اس کا نقطۂ عروج آزاد کی تصنیف آب حیات ہے۔ یہاں تک پہنچ کر تذکرے اپنا قدیم چوغا اُتارتے اور خلعت جدید زیب تن کرتے ہیں۔ جس سے تذکروں میں تاریخ اور تنقید کا رنگ بدلتا ہے۔ چناں چہ آج تک حتمی فیصلہ نہیں ہوسکا۔ محمد

حسین آزاد کی آبِ حیات کو تاریخ، تنقید یا تذکرہ کہا جائے۔ اس کتاب کا نعم البدل اُردو تو درکنار فارسی ادبیات میں بھی میسر نہیں آتا۔ مولانا آزاد نے اپنے مقصد کے پیش نظر اس تصنیف میں قدیم تذکرہ نگاری کے برعکس ایک نئے انداز میں اپنے مشاہیر کو جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے دکھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ اُسلوب بالکل ایک نئی دریافت ہے۔ تنقیدی لحاظ سے اس پر جانبداری کا بھی الزام درست معلوم ہوتا ہے۔ مولانا آزاد نے غالبؔ کی نظم ونثر دونوں کو الگ الگ ذیل میں موضوع بنایا ہے اور خطوط کی شوخی وظرافت کی بڑے خوب صورت انداز میں داد دی ہے۔ مولانا آزاد کی یہ تصنیف پہلی مرتبہ ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی۔ غالبؔ کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس میں کلام نہیں۔ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین ومعنی کے بیشہ کے شیر تھے۔ دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ اول، معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوۂ خاص تھا۔ دوسرے چوں کہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انھیں طبعی تعلق تھا۔ اس لیے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں۔ لیکن جو شعر صاف نکل گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے''۔ [۱۹]

مولانا آزاد کی آبِ حیات کے بعد اس سلسلہ کی آخری کڑی صفیر بلگرامی کے تذکرے جلوۂ خضر کی صورت میں ہے۔ صفیر کا یہ تذکرہ پہلی مرتبہ ۱۸۸۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔ صفیر کے تذکرے کی خوبی یہی کافی ہے کہ اس نے غالب کی نظم ونثر کے بارے میں لکھا کہ انھوں نے اُردو نثر اور نظم کو جدیدیت کا لبادہ اڑایا۔ صفیر کے تذکرے کے بعد کوئی اہم تذکرہ نظر نہیں آتا۔ اس لیے کہ یہاں تک پہنچ کر غالب شناسی کی روایت محض تذکروں کے بجائے رسائل وجرائد میں مضامین کی صورت میں بھی منظرِ عام پر آنے لگی۔ یعنی اب اخبارات میں بھی غالب پر بہت کچھ لکھا جانے لگا۔ اخبارات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کے بارے میں ان کے معاصر اخبار معمولی سے معمولی خبر بھی چھاپتے تھے اور وفات کے بعد تو

ان پر تبصروں کا ایک سلسلہ چل نکلا تھا۔ غالب شناسی کی اس روایت کی ایک شاخ غالب کی تصانیف پر معاصرین کی تقریظیں یا معاصرین کی تصانیف پر غالب کی تقریظیں بھی ہیں۔ غالب کی کتب پر اکثر و بیشتر اپنے عہد کے مستند عالم و فاضل اور مرزا کے عزیز نواب ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں کی تقریظیں ہیں۔ نواب موصوف اپنے وقت کے معروف و مستند تقریظ نگار مانے جاتے تھے۔ چناں چہ دیوان غالب کی پہلی اشاعت کے لیے بھی انہیں کے ہاتھوں تقریظ لکھی گئی۔ تاہم انیسویں صدی کے آخر تک غالب شناسی کا اہم مآخذ تذکرے ہی قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ البتہ باقی عناصر کو جزوی حیثیت حاصل رہی ہے۔ تذکروں کے اس ماحول اور انیسویں صدی میں مطالعہ غالب کی روایت میں تنقیدی اشارات کا ذکر کرتے ہوئے نیز اس سارے دور کی بحث کو سمیٹتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

> "مجموعی طور پر ان تذکروں میں جو تنقیدی رائیں دی گئی ہیں۔ ان میں اختصار کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ غالب اپنے زمانے کے اہم شاعر تھے۔ ان کا کلام معنویت سے بھرپور تھا۔ وہ نئے نئے خیالات کو اپنی شاعری میں پیش کرتے تھے اور پیش کرنے کا انداز بھی نیا تھا۔ ان کے ہاں تخیل کی فراوانی تھی اور وہ تخیل سے اپنی شاعری کو رنگین و پرکار بناتے تھے۔ فارسی شاعری کی روایت کے اثرات ان پر بڑے گہرے ہیں اور انھوں نے اس روایت سے بہت استفادہ کیا ہے۔"[۲]

یادگارِ غالب:

مطالعہ غالب کی یہ روایت جو ابھی تک تذکروں یا تاریخ کے چند صفحات پر جگہ پاتی تھی اس روایت کی ایک خاموش بہتی ندی میں مولانا حالی کی یادگارِ غالب ایک بھاری پتھر کی طرح گرتی ہے جس سے اٹھنے والی لہریں حدود کو توڑ دیتی ہیں۔ مولانا کی یادگارِ غالب ایک شریف انسان کا دوسرے شریف انسان کی سرگزشت، ذاتی تجربات

اور مشاہدات کی روشنی میں بیان کرنے کا نام ہے۔ غالب شناسی کی روایت کی اس قلم رو میں حالی کو کولمبس کا درجہ دیا گیا۔ حالی کی تصنیف سے غالبیات کی دریافت میں ایک نئی ہمہ گیر تحریک کا وہ آغاز ہوا کہ مستقبل کی کوئی تصنیف بھی اس سے آنکھ چرا کر نہ گزر سکی۔ آنے والی صدیوں نے اس کو اپنے لیے سنگِ میل بنایا۔ اس کی اہمیت پر ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

> ''یادگار غالب اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ اب تک کلام غالب پر متعدد کتابیں نکل چکی ہیں لیکن جو شہرت اس کے حصے میں آئی وہ کسی اور کو حاصل نہ ہو سکی۔''[۲۱]

بیسویں صدی کو غالب صدی کے طور پر منائے جانے کا سہرا بڑی حد تک حالی کے سر آتا ہے۔ اگر وہ پہلی مرتبہ اس قدر بھرپور اور جامع انداز میں غالب کے کلام اور نثر کے ساتھ ساتھ ان کی سوانح مرتب نہ کرتے تو شاید یہ روایت آج بہت پیچھے ہوتی۔ بیسویں صدی میں غالب کے مطالعہ پر اس یادگار تحریر نے جو اثر ڈالا اس کا ثبوت ڈاکٹر معین الرحمٰن کے اس جملہ سے واضح ہوتا ہے:

> ''حالی کی یادگار غالب، بیسویں صدی کے لیے غالب کی دریافت کا درجہ رکھتی ہے۔''[۲۲]

پہلی مرتبہ یادگار غالب ۱۸۹۷ء میں مطبع نامی کان پور سے چھپی۔ اس میں پہلی مرتبہ غالب کے مکمل حالات اور اس کے کلام پر مبسوط بحث کی گئی۔ بایں ہمہ کلامِ غالب کو فارسی اور اُردو کے دوسرے اساتذہ کے کلام سے موازنہ سے پیش کیا گیا اور اس کے فنی پہلوؤں کی نشان دہی کی گئی۔

یادگار غالب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں سوانحی حالات اور دوسرے میں ریویو اور انتخاب کلام شامل ہے۔ پہلا حصہ دوسرے سے قدرے مختصر ہے۔ دوسرے میں اکثر جگہ مرزا کی فطری بذلہ سنجی اور ظرافت کا اظہار ان کے چٹکلوں اور لطیفوں کے بیان سے کیا گیا ہے۔ آخر میں مرزا کی حیات کا نچوڑ ایک ریویو میں پیش کیا ہے اس میں غالب کی شاعرانہ خصوصیات جس طرح بیان کی گئی ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱۔ یہ شاعری حالات کی پیداوار ہے اور اس میں ایک ارتقائی عمل نظر آتا ہے۔

۲۔ شاعری کی خوبی اس کی جدت ادا اور روش عام سے ہٹ کر ہونے میں ہے۔

۳۔ شوخی اور ظرافت اس شاعری کا ایک بنیادی وصف ہے۔

۴۔ تہہ در تہہ معنویت کلامِ غالب کو دوسرے شعرا کے کلام سے ممتاز کرتی ہے۔

۵۔ رمز و ایمائیت اور لطف و ایہام بھی اس شاعری کا ایک خاص کمال ہے۔

چوں کہ حالی بنیادی طور پر دبستانِ سرسید کے رکنِ رکین تھے۔ اس لیے انھوں نے بحیثیت مجموعی اپنی تنقید میں اخلاقی نقطۂ نظر کو پس منظر میں ضرور پیش کیا ہے۔ چناں چہ کلام غالب کو افادی پہلوؤں سے جانچنا حالی کے مخصوص اندازِ تنقید کو ظاہر کرتا ہے۔

دیوان غالب کی شرحیں:

مولانا حالی کی دکھائی ہوئی راہ پر چل کر ان کی تصنیف کے فوراً بعد ۱۸۹۹ء میں سید محمد موج نے ۳۲ صفحات کا ایک سوانحی خاکہ لکھا جو بذات خود تو اہم نہیں ہے لیکن اسے یادگارِ غالب کا خلاصہ ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس دوران مطالعۂ غالب کی دوسری اہم کڑی دیوانِ غالب کی تشریح و تفہیم کے لیے چھپنے والی شرحیں ہیں۔ اُردو کے کسی اور شاعر کا کلام اتنی مرتبہ شرح کے زیور سے آراستہ نہیں ہوا ہوگا جتنا کلامِ غالب۔ کلامِ غالب کو سمجھنے سمجھانے کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب پہلی مرتبہ مدراس یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کیا گیا۔ اس ضمن میں مسلم ضیائی تحریر کرتے ہیں:

> ''انیسویں صدی کے اواخر میں مولوی علی حیدر نظم طباطبائی کی تحریک پر غالب کا دیوان مدراس یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہوا تو ضرورت اس بات کی محسوس ہوئی کہ غالب کے اشعار کی تشریح کی جائے۔ یوں تو خود غالب نے احباب کے دریافت کرنے پر اپنے کئی اشعار کی خود تشریح کی ہے لیکن یہاں مسئلہ پورے دیوان کے اشعار کا تھا۔''۲۳

وثوق صراحت:

دیوانِ غالب کی پہلی شرح وثوقِ صراحت کے نام سے ۱۸۹۲،۱۸۹۱ء میں عبدالعلی وآلہ دکنی نے لکھی۔ اس کی اشاعت یادگارِ غالب کی اشاعت سے تھوڑا عرصہ قبل ۱۸۹۳ء میں ہوئی۔ چوں کہ موصوف نے اپنے تدریسی فرائض کے لیے اپنے نسخے پر حاشیے میں اس کو لکھا تھا اس لیے یہ محض اشارات تک ہی محدود ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اسے مکمل کریں گے لیکن وفات نے مہلت نہ دی۔ جس سے وہ ان سرخیوں کی تفصیل نہ دے سکے۔

وجدان تحقیق :

عبدالعلی والہ دکنی کی تشریح پر تشنگی کا الزام لگایا گیا چناں چہ تنقیدی الزام سے بچنے کے لیے ان کے بیٹے عبدالواحد واجد نے اس شرح کی تفصیل لکھی۔ انھوں نے اپنی اس شرح میں اپنی قابلیت کا خوب اظہار کیا ہے۔ یہ شرح پہلی مرتبہ ۱۹۰۲ء میں نظامی داس پریس حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی اس کے بعد مندرجہ بالا دونوں شرحوں کا کوئی ایڈیشن نہیں چھپا۔

شرحِ دیوان غالب اُردو :

مولوی علی حیدر نظم طباطبائی بھی عبدالعلی وآلہ دکنی کی طرح نظام کالج حیدرآباد دکن میں اُستاد تھے۔ انھوں نے اپنی شرح تو انیسویں صدی کے خاتمہ پر مکمل کر لی تھی لیکن شائع بیسویں صدی میں ہوئی۔ افسوس ہے کہ ان کی شرح کے بیشتر ایڈیشن پر سنِ اشاعت درج نہیں ہے۔ البتہ صرف ایک ایڈیشن ۱۹۵۴ء پر سنِ اشاعت درج ہے۔ نظم طباطبائی چوں کہ شاعر اور نثر نگار بھی تھے، نیز عربی و فارسی اور اُردو ادبیات کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ اس لیے ان کی شرح بہتر ہے۔ انھوں نے کلامِ غالب میں زبان و بیان کے سلسلے میں بعض جگہ اختلاف بھی کیا ہے۔

حلِ کلیاتِ غالب:

انیسویں صدی کے آخر میں رسائل میں غالب پر جو کچھ لکھا گیا ان میں میرٹھ سے شائع ہونے والے رسالہ پروانہ کا بھی خاص مقام ہے۔ سید شوکت حسن میرٹھی نے اس رسالہ میں اپنی لیاقت اور قابلیت کے دعوے کرتے ہوئے کلام غالب کی شرح مختلف اقساط میں پیش کی۔ انھوں نے کلامِ غالب میں نہایت مہمل قسم کی ترامیم کر کے ان کی شرح بھی پیش کر دی۔ اس شرح کی اشاعت کا بھی سن درج نہیں ہے۔ البتہ مکمل کتابی صورت میں یہ شرح بیسویں صدی کے آغاز میں چھپی۔

دیوان غالب مع شرح:

بیسویں صدی کی مقبول ترین شخصیات میں مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کا نام سرفہرست ہے۔ آپ تحریکِ آزادی کے ایسے نمائندہ سیاست دان تھے کہ جن کے ہاں قیدِ فرنگ اور چکی کی مشقت اور مشقِ سخن دونوں ساتھ ساتھ جاری رہتی تھیں۔ آپ کی اَدبی خدمات میں دیوانِ غالب کی شرح نمایاں مقام رکھتی ہے۔ ۱۹۰۹ء میں علی گڑھ سے اس کو شائع کیا گیا اور بعد میں بھی کئی بار اس کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا۔

گنجینہ تحقیق:

سید محمد بے خود موہانی کی اس شرح کے بعض حصے نیرنگِ خیال اور لکھنؤ کے رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ اس کو کتابی شکل میں نظامی پریس لکھنؤ نے ۱۹۲۵ء میں شائع کیا۔

ہدیہ سعید:

قاضی سعید الدین نے دیوانِ غالب کی شرح کے ساتھ غالب کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام پر تنقیدی اشارات قلم بند کیے۔ ان کی کوشش سے ۱۹۲۶ء میں یہ کتاب

مسلم یونیورسٹی، پریس علی گڑھ سے شائع ہوئی۔

مکمل شرح دیوان غالب:

دیوان غالب کی شرحوں کا ایک سلسلہ چل نکلا ہے۔اس میں عبدالباری آسی کی شرح بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔آسی کی اَدبی خدمات سے تو کسی طور پر بھی انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن غالب کے سلسلے میں انھوں نے یہ کمال دکھایا ہے کہ اپنی غزلوں کو غالب سے منسوب کر دیا۔ یہ ضرور ناانصافی ہوئی ہے۔ان کی شرح کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔بعد میں اس کے متعدد ایڈیشن صدیق بک ڈپو، لکھنؤ سے چھپے۔

تشریحاتِ غالب کا یہ وسیع سلسلہ ایک الگ موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔جس کے لیے تفصیلی مطالعہ کی ضرورت ہے۔تاہم اس سرسری مطالعہ سے واضح ہے کہ دیوان غالب کی یہ شرحیں غالب شناسی کے ارتقا میں سند کا درجہ رکھتی ہیں۔

محاسن کلام غالب:

مطالعہ غالب کی روایت میں ایک کشمکش کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب عبدالرحمٰن بجنوری کا مشہور مقدمہ بہ عنوان محاسن کلام غالب جو دیوان غالب، نسخہ حمیدیہ کی اشاعت کے ساتھ ۱۹۲۱ء میں چھپا ہے۔اس میں غالب کو روحانی شخصیت کے طور سے پیش کر کے اور عقیدت کے تند و تیز دھارے میں بہہ کر بجنوری کلامِ غالب کو مقدس وید کے برابر قرار دیتے ہیں۔

۱۹۱۸ء۔۱۹۱۹ء کے درمیان میں مفتی انوارالحق نے دیوان غالبؔ کا قدیم نسخہ بھوپال مرتب کیا۔جس کا مقدمہ عبدالرحمٰن بجنوری نے بہ عنوان ”محاسن کلام غالب“ لکھا۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے اس طویل دیباچے میں غالب کے کلام کا نامور انگریزی شعرا سے موازنہ کیا اور گوئٹے وغیرہ کی رومانیت کی نشان دہی اس کلام سے کی۔اس دیباچہ کی ایک اہم بات اس کا پہلا جملہ تھا۔جو خود غالب کی ایک مثنوی سے ماخوذ ہے۔جس میں دیوان

غالب اور مقدس وید کو ہی صرف ہندستان کی مقدس اور الہامی کتابیں قرار دیا گیا۔ بایں ہمہ بجنوری نے زندگی کا ہر پہلو دیوان غالب میں دیکھ لیا اور دوسروں کو دکھانے کی کوشش کی۔ چناں چہ بجنوری لکھتے ہیں:

''کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے۔''۲۴

بجنوری نے کلامِ غالب میں فلسفیانہ پہلوؤں کا بھی کھوج لگایا اور مثالوں سے ثابت کیا۔ بجنوری کی تحقیق میں جو منفرد پہلو تھا وہ یہ کہ کلامِ غالب میں دیہاتی ماحول کے برعکس شہروں کے ماحول کی عکاسی زیادہ کی گئی ہے۔ یہ مرزا کے تہذیبی لگاؤ کی آئینہ دار اور غالب کے شہری ورثے کی پیداوار ہے۔ بجنوری نے عالمانہ اور فلسفیانہ رنگ کو تاثراتی آہنگ سے مربوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ گویا غالب کے پہلے باقاعدہ نقاد مولانا حالی نے انھیں افادی پس منظر میں رکھا تھا تو بجنوری نے انھیں رومانی اور تاثراتی حوالے سے دیکھا۔ بجنوری کی اس کاوش کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

''بجنوری کا مقدمہ تنقید غالب نہیں، غالب کی خدمات میں نئی نسل کا خراجِ عقیدت ہے۔''۲۵

تاریخ ادب اُردو:

بیسویں صدی کے شروع میں غالب شناسی کی روایت کی اگلی سیڑھی ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی انگریزی تصنیف ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ بعد میں اس کے اُردو ترجمے کے بھی مختلف ایڈیشن چھپتے رہے۔ سکسینہ نے غالب کے فطری رجحانات اور سوانحی حالات و کلامِ غالب پر تنقید کا ایک سلجھا ہوا معیار قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے پہلی مرتبہ کلام کو تین ادوار میں تقسیم کر کے اس کو سمجھنے کی کوشش کی ہے:

۱۔ زمانۂ آغاز سے ۲۵ سال کی عمر تک کا کلام۔

۲۔ فارسیت کا غلبہ اور زبان کی صفائی۔

۳۔ زمانۂ عروج کا کلام۔

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کے قائم کردہ ادوار کی خصوصیت یہ ہے کہ انھیں سنین کے برعکس کلام کی خصوصیات کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ کلامِ غالب پر مرزا کی فطری طبائع کا جس قدر اثر پڑا اس میں جذبات نگاری کے ذکر میں سکسینہ لکھتے ہیں:

''مرزا کے کلام میں بچوں کی سی ضد اور اپنے معاصر انگریزی شاعر شیلی کی طرح تنک مزاجی پائی جاتی ہے۔''۲۶

غالب :

غالب شناسی کی روایت میں جن ابتدائی کتب کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ان میں ڈاکٹر عبداللطیف کی انگریزی تصنیف غالب بھی شامل ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب دراصل عبدالرحمٰن بجنوری کے محاسن کلام غالب کے عقیدت مندانہ اور انتہا پسندانہ رویے کے خلاف ایک قدم ہے۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے غالب شناسی میں اس یک طرفہ رجحان کو غیر متوازن اور غلط قرار دیا۔ اس لیے انھوں نے بجنوری کے تنقیدی انداز کو معیارِ تنقید کے خلاف قرار دیا۔ چناں چہ وہ اپنی کتاب کے عنوان سرگزشت میں لکھتے ہیں:

''وہ شاعر کو پیش کرنے کے بجائے اپنے اعلا تنقید کو پیش کر رہے ہیں اور غالب سے واقف ہونے یا واقف کرانے کی جگہ اپنے معیارِ تنقید پر شاعر کے کارناموں کو اس طرح پرکھنا چاہتے ہیں کہ غالب کی شاعری نمایاں ہونے کی جگہ پس کر رہ گئی ہے۔''۲۷

بجنوری پر تنقید کے برعکس لطیف کا اپنا انداز معیارِ تنقید بھی غیر جانبدارانہ نہیں رہا۔ یہاں تک کہ اس پس منظر میں بھی ان کی نفرت کا جذبہ ابھر ہی آیا ہے۔ چناں چہ ان کا غالب کی عظمت پر شک کرنا اس کا بین ثبوت ہے۔ غالب کی شاعری میں بجنوری کی بتائی ہوئی رومانیت بھی انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس لیے لکھتے ہیں:

''بہ حیثیت ایک لفظی صنعت گر کے غالب تمام اُردو غزل گو شعرا میں ایک

بلند مرتبہ پر فائز نظر آتا ہے، لیکن بہ حیثیت شاعر کے وہ جتلا فریب
رہا۔.....اس ربانی تجلی کو جو بحیثیت شاعر کے اس کو عطا کی گئی تھی اس نے
اپنے ہاتھ سے دے دیا۔"[۴۸]

مندرجہ بالا خیالات کے باوجود لطیف کے علمی سرمائے کو دیکھا جائے تو بہ حیثیت مجموعی ان کی تصنیف بڑی حد تک متوازن اور ہم وار ہے۔ نیز اس کا اثر مستقبل پر خاطر خواہ طور پر دیکھنے میں آتا ہے۔ لطیف نے اپنی تصنیف میں جن امور پر توجہ دلائی ہے ان میں خاص یہ ہیں۔

۱۔ دیوان غالب کی تاریخی ترتیب ہونی چاہیے تا کہ غالب کے ذہنی ارتقا کا اندازہ لگایا جا سکے۔

۲۔ خطوطِ غالب کی روشنی میں واقعات کی چھان بین کر کے مرزا کی سوانح حیات مرتب کرنی ہوگی۔

۳۔ غالب کے اُستاد عبدالصمد کا مسئلہ بھی تحقیق کا موضوع بننا چاہیے۔

۴۔ ہم عصر اُدب کے استفادے سے مرزا کے ماحول اور تہذیبی پس منظر کو سمجھا جا سکتا ہے۔

۵۔ ان شعرا کو بھی تنقید کے پیشِ نظر رکھنا چاہیے جن سے غالب متاثر ہوئے نیز جو کلامِ غالب میں اپنے اثرات چھوڑ گئے ان میں بیدل، میر اور عرفی وغیرہ شامل ہیں۔

۶۔ جن خطوط میں تاریخیں درج نہیں ہیں ان کی داخلی شہادتوں کی بنا پر تاریخ درج کرنی چاہیے۔

اس ضمن میں لطیف نے ایک خاکہ بنا کر ان کا نمونہ بھی پیش کر دیا ہے۔ یہاں تک پہنچ کر مطالعہ غالب کی روایت اس قدر ہمہ گیر ہو چکی تھی کہ غالب کی تنقید کے دو بڑے گروہ بن گئے ہیں، ایک موافقین کا اور ایک مخالفین اور ہر گروہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا ہے۔

غالب شکن :

غالب شناسی کی اس شدت تاثیر میں ایک اہم اضافہ یگانہ چنگیزی کی تحریر غالب شکن سے ہوا۔ ۲۵ ردسمبر ۱۹۳۳ء کے لکھے ہوئے ایک خط میں جو یگانہ نے مشہور محقق و نقاد مسعود حسن رضوی ادیب کے نام لکھا۔ اس میں غالب پر کڑی تنقید کی گئی ہے۔ ہر چند یہ مخالفانہ شدت غالب کے سو سال کے عرصہ وفات کے باوجود کم نہیں ہوئی۔ یگانہ نے جس طرح مرزا کے خلاف جی کے پھپھولے پھوڑے ہیں ان سے بجنوری کی انتہا پسندی بھی کنی کتراتی ہے۔ کمال یہ ہے کہ اس نفی سے بھی اثبات مترشح ہوتا ہے گویا مبہم الفاظ میں یگانہ غالب کے معترف نظر آتے ہیں۔ یگانہ کی غالب شکن سوچ کے بارے میں رسالہ افکار، اس کی اہمیت یوں بیان کرتا ہے:

> ''ماخذات غالب میں، غالب شکن، کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے شائع ہوتے ہی غالب کو سمجھنے سمجھانے کی ایک ہمہ گیر تحریک شروع ہو گئی۔ معاندانہ لب ولہجہ، مغلوب الغیظ اُسلوب، لاگ اور لگاؤ کی باتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے ''غالب شکن'' کا مطالعہ کیا جائے تو واضح اور غیر مبہم الفاظ میں یگانہ غالب کے اوصاف شعری کے معترف اور ان کی حقیقی قدر و منزلت میں سب سے آگے نظر آئیں گے...... اس طرح تنقیدی شعور کی آبیاری میں یگانہ چنگیزی کی منفی تنقید نے جو کام کیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ منفی فکر کے مثبت اثرات کا نام ''غالب شکن ہے''۔ ۲۹

غالب :

غالبیات کے تحقیقی سلسلے کی ایک اہم تصنیف مولانا غلام رسول مہر کی غالب ہے۔ یہ پہلی بار ۱۹۳۶ء میں منظر عام پر آئی۔ غالب کی سوانح عمری کے بارے میں سب سے پہلے مولانا حالی نے سیر حاصل بحث کی تھی۔ اس کوشش کے باوجود مولانا حالی نے شاعری کے برعکس سوانح کو ذیلی طور پر پیش کیا ہے۔ خطوط غالب کی روشنی میں مرزا کی سوانح

حیات مرتب کرنے کی طرف سب سے پہلے ڈاکٹر عبداللطیف نے توجہ دلائی تاکہ ہم غالب کے بارے میں غیر ضروری مباحث سے بچے رہیں۔ چناں چہ مولانا غلام رسول مہر نے خطوط غالب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مرزا کی سوانح حیات مرتب کی ہے۔ مولانا مہر کا یہ کام غالبیات میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ چناں چہ اَدبی حلقوں کی طرف سے مولانا مہر کے اس کارنامے کو بہت سراہا گیا۔ اسی لیے مولانا عرشی بھی کہنے پر مجبور ہوئے کہ اس موضوع پر ایک عرصے تک قلم اٹھانے کی گنجائش باقی نہیں رہنے دی گئی۔

غالب نامہ:

مولانا عرشی تک مطالعہ غالب کی اس روایت کی آخری کڑی ڈاکٹر شیخ اکرام کی تصنیف غالب نامہ ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اس نادر اور گراں قدر علمی و اَدبی تصنیف نے ''غالبیات'' میں اپنے گہرے اثرات چھوڑے۔ ڈاکٹر موصوف نے اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک میں حیاتِ غالب کا بیان ہے دوسرے میں ان کا موضوع بحث تنقیدِ غالب رہا جب کہ اس کتاب کا اہم ترین حصہ تیسرا ہے۔ جس میں پہلی بار کلام غالب کے بارے میں اعلا تنقیدی شعور کا ثبوت فراہم کیا گیا ہے۔ اس میں کلام کی ادوار کے لحاظ سے درجہ بندی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے کلام غالب کو تاریخی ترتیب سے پیش کرنے کی جس خواہش کا اظہار ۱۹۲۸ء میں کیا تھا، ڈاکٹر شیخ اکرام نے کلام کو تاریخی ترتیب سے مرتب کر کے اس بصیرت کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ اس کتاب کے تنقیدی حصے میں کلام کی درجہ بندی ادوار کے مطابق کی ہے اور پھر ہر دور کو الگ سے موضوع بحث بنایا ہے۔ جس میں اہم شعرا سے موازنہ بھی کرتے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ان شعرا کو بھی اپنی تنقید میں جگہ دی جو کسی نہ کسی طرح سے کلام غالب پر اثر انداز ہوئے۔ گویا شیخ اکرام کی تنقید توازن اور تناسب کا علمی ثبوت تھی۔ ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن کا کہنا ہے:

''اکرام نے غالب کے مطالعہ کے سلسلے میں تاریخی کارنامہ انجام دیا

ہے۔وہ غالب کو نہ حالی کی طرح قدیم معیاروں میں گم کردیتے ہیں۔نہ بجنوری کی طرح ان کے گرد گوئٹے اور الہامی کتابوں کا دائرہ بناتے ہیں اور نہ لطیف کی طرح انھیں معمولی دنیادار انسان اور معمولی سے کچھ اعلا شاعر کے روپ میں دیکھتے ہیں۔"۳۰

غالب شناسی کی اس روایت کے پس منظر میں دیوان غالب اُردو کی چند اہم اشاعتوں کا سن وار تعارف بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔اس لیے کہ دیوان غالب کی اشاعت کا تقاضا ہی تھا جس کے باعث یہ اہل ذوق کی آنکھوں کا سرمہ بنا۔چناں چہ خاص خاص ایڈیشن جو شائع ہوئے ان کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ دیوان غالب اُردو طبع اول ۱۸۴۱ء مطبع سید المطابع، دہلی۔
۲۔ دیوان غالب اُردو طبع دوم ۱۸۴۷ء مطبع دار السلام، دہلی۔
۳۔ دیوان غالب اُردو طبع سوم ۱۸۶۱ء مطبع احمدی، دہلی۔
۴۔ دیوان غالب اُردو طبع چہارم ۱۸۶۳ء مطبع نظامی، کان پور۔
۵۔ دیوان غالب اُردو طبع پنجم ۱۸۶۳ء مفید خلائق، آگرہ۔

مندرجہ بالا پانچوں ایڈیشن غالب کی زندگی میں شائع ہوئے۔ان کی وفات کے بعد بھی اس کی اشاعت جاری رہی۔بیسویں صدی میں شرحوں کی صورت میں بھی دیوانِ غالب کئی بار چھپا۔البتہ اس کی خاص اشاعتوں میں مندرجہ ذیل اشاعتیں قابل ذکر ہیں:

دیوان غالب جدید، نسخۂ حمیدیہ ۱۹۲۱ء مطبع مفید عام اسٹیم پریس، آگرہ۔
دیوان غالب مرتبہ : ذاکر حسین ۱۹۲۵ء برلن، جرمنی۔
مرقع غالب مرتبہ: عبدالرحمٰن چغتائی ۱۹۲۸ء لاہور۔
نقش چغتائی مرتبہ :عبدالرحمٰن چغتائی ۱۹۳۵ء لاہور۔

مطالعہ غالب کی یہ روایت اپنے آغاز سے لے کر مولانا عرشی تک جن مختلف مراحل سے گزری ان کی مختصر جھلک ہم دیکھ چکے ہیں۔غالب شناسی کی اس روایت میں مولانا عرشی کی باقاعدہ شمولیت ۱۹۳۷ء میں مکاتیب غالب کے مرتب کی حیثیت سے ہوئی ہے۔پھر مولانا

عرشی اپنی وفات تک اس روایت میں نادر اضافے کرتے رہے۔ غرض مولانا کی غالب شناسی نے اس روایت میں مکاتیبِ غالب سے لے کر کلامِ غالب، تنقیدِ غالب اور تحقیقِ غالب غرض ہر پہلو پر اس میں دائمی اور ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں جن کی نشان دہی آئندہ ابواب میں کی گئی ہے۔

حواشی

۱۔ احوال ونقد غالب، مرتبہ محمد حیات خان سیال، طبع اول ۱۹۶۷ء، مطبوعہ نذر سنز، لاہور، ص ۸۴۔

۲۔ خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول مہر۔ خط بنام قدر بلگرامی، فروری ۱۸۵۷ء، ص ۳۶۔

۳۔ بحوالہ تحقیق غالب، ڈاکٹر سید معین الرحمن، طبع اول ۱۹۸۱ء۔

۴۔ یادگار غالب۔ طبع اکتوبر ۱۹۶۲ء، مطبع اسپلیکا پریس، کراچی، ص ۱۲۸۔

۵۔ بحوالہ مرزا غالب اور میر تقی میر۔ ماہ نو، کراچی۔ فروری ۱۹۴۹ء۔

۶۔ ذکر غالب۔ مالک رام، ص ۴۳۔

۷۔ ذکر غالب۔ مالک رام، ص ۴۳

۸۔ غالب، شاعر امروز وفردا، طبع اول، ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء، لاہور، ص ۵۔

۹۔ غالب۔ شاعر امروز وفردا طبع اول، ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء، لاہور، ص ۵۔

۱۰۔ "عیار الشعراء" بحوالہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری "اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" طبع اول: نومبر ۱۹۷۲ء مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور، ص ۲۰۶۔

۱۱۔ بحوالہ احوال ونقد غالب، نقش اول جنوری ۱۹۶۷ء۔ مرتبہ: محمد حیات خان سیال، مطبوعہ نذر سنز، لاہور، ص ۸۱۹۔

۱۲۔ بحوالہ احوال ونقد غالب، نقش اول جنوری ۱۹۶۷ء۔ مرتبہ: محمد حیات خان سیال، مطبوعہ نذر سنز، لاہور، ص ۸۱۹۔

۱۳۔ بحوالہ گلشن بے خار، طبع اول۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء، مطبوعہ مجلس ترقی ادب، ص ۱۳۹۔

۱۴۔ بحوالہ غالب اور مطالعہ غالب۔

۱۵۔ اردو ترجمہ گلشن بے خار۔ طبع اول اکتوبر ۱۹۷۳۔ مطبوعہ مجلس ترقی ادب، ص ۳۳۲۔

۱۶۔ گلدستہ نازنیناں: مطبوعہ رفاہ عام پریس، ص ۱۰۶۔

۱۷۔ رشید احمد صدیقی بحوالہ: احوال غالب، مرتبہ مختار الدین، ص ۱۰۔

۱۸۔ آثار الصنادید، طبع اول: مطبوعہ انٹرنیشنل پریس، کراچی۔ ۱۹۶۶ء، ص ۳۰۰۔

۱۹۔ آب حیات، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۵۰۳۔۵۰۴۔

۲۰۔ غالب اور مطالعہ غالب، طبع اول ۱۹۶۹ء، ص ۴۸۔۳۲۷۔

۲۱۔ نذر غالب۔ ص ۱۸۴۔

۲۲۔ اشاریہ غالب، طبع اول ۱۹۶۹ء، ص ۱۳۔

۲۳۔ بحوالہ رسالہ "ماہ نو" کراچی، فروری ۱۹۷۰ء، جلد ۲، شمارہ ۲۔

۲۴۔ بحوالہ محاسن کلام غالب۔ ص ۱، مطبوعہ کتاب، اکرام باغ روڈ، کراچی، مطبع جاوید پریس

۲۵۔ احوال و نقد غالب، مرتبہ حیات خان سیال، طبع اول ۱۹۶۷ء، مطبوعہ، نذر سنز، لاہور، ص ۸۲۴۔

۲۶۔ تاریخ ادب اردو۔ ترجمہ مرزا محمد عسکری ص ۲۳۸۔

۲۷۔ بحوالہ غالب۔ مترجمہ سید معین الدین قریشی، بحوالہ سرگزشت، ص ۱۳۔

۲۸۔ بحوالہ غالب۔ معین الدین قریشی، مطبوعہ جہان گر بکڈپو، کھاری باؤلی، دہلی، ص ۱۳۹۔۱۴۰۔

۲۹۔ بحوالہ رسالہ "افکار" کراچی، غالب نمبر ۱۹۶۹ء، ص ۴۵۷۔

۳۰۔ احوال و نقد غالب، مرتبہ طبع اول، ۱۹۶۷ء۔ مطبوعہ نذر سنز، لاہور، ص ۸۳۰۔

◆◆◆

تیسرا باب

نگارشاتِ عرشی بسلسلہ غالبؔ

◆◆

غالبؔ شناسی کا وہ رجحان جو انیسویں صدی میں شروع ہوا تھا بیسویں صدی میں ایک اَدبی تحریک کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس روایت کے فروغ میں مولانا حالیؔ انیسویں صدی میں قدآور شخصیت کے طور پر نظر آتے ہیں۔ بیسویں صدی میں غالبؔ کے شیدائی عبدالرحمٰن بجنوری ہیں اور ان کا نعرہ مستانہ ایک گونج ہے جس نے سب کے کانوں کو گنگ کر دیا ہے۔ ہرچند اسے کوئی سمجھ سکا یا نہ سمجھ سکا۔ عبدالرحمٰن بجنوری کے علاوہ حسرت موہانی اور دیگر اکابرین کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جنھوں نے **دیوان غالب** کی تشریحات سے اس روایت کو استحکام بخشا۔ بایں ہمہ مخالفین میں ڈاکٹر عبداللطیف بھی تعریف کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک معروضی نقطہ نظر پر زور دینے کی تاکید کی اگرچہ وہ اپنے اس دعوا پر خود بھی قائم نہ رہے اور مخالفت کی ڈنڈی مار ہی گئے۔ اس روایت کو مستحکم کرنے والوں میں اہم نام شیخ اکرام کا ہے اور ان کی معرکۃ الآرا تصنیف **غالب نامہ** کو مطالعہ غالب کی روایت میں ہمیشہ سنگِ میل کی حیثیت حاصل رہے گی۔ شیخ اکرم کے بعد نمایاں شخصیت مولانا غلام رسول مہر کی ہے جنھوں نے بعد میں بھی نہ صرف اس روایت کی آبیاری کی بلکہ اسے اس مقام پر پہنچایا کہ فلکِ غالبیات کے درخشندہ ستارے کی طرح راہنمائی کرتے نظر آتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء تک غالب شناسی کی روایت کو ہم مندرجہ بالا شخصیات کے ساتھ منسوب کر سکتے ہیں۔

بعد ازاں بعد جن لوگوں نے غالبؔ شناسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور اپنی تمام تر

مصروفیاتِ تلاش غالبؔ میں اور عرفانِ غالبؔ میں صرف کر دیں ان میں مولانا امتیاز علی خان عرشی کا اسمِ گرامی سرِفہرست ہے۔ مولانا عرشیؔ کی غالب پرستی جس میں خلوصِ نیت اور خلوصِ دل بھی شامل رہا ہے یہ صرف غالبؔ پسندی نہیں بل کہ عشقِ غالبؔ کا درجہ رکھتی ہے اور عاشقانِ غالبؔ میں ان کا نام اولیت کا درجہ رکھتا ہے۔ انھوں نے غالبؔ کو ردی کی ٹوکریوں سے نکال کے شفاف آئینہ خانوں میں وہ جگہ دی کہ علمی و اَدبی حلقے مولانا عرشی کی کارکردگی پر انگشت بدنداں رہ گئے۔

مولانا عرشیؔ کی غالبؔ شناسی اور غالبؔ پرستی کو جہاں ان کے معاصر اہلِ قلم اور ادیب حضرات نے سراہا وہاں ہندستان کے اعلا حکام بھی ان کی علمی و اَدبی خدمات پر داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ صدر جمہوریہ ہند جناب ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعریفی کلمات اس سلسلہ میں سند ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

> ’’عرشیؔ صاحب نے غالبؔ کی نظم و نثر کو بہترین حسنِ ترتیب سے شائع کیا ہے۔ غالبؔ نے جو خطوط نواب یوسف علی خان والیٔ رام پور اور ان کے جانشین نواب کلب علی خان کے نام لکھے تھے انھیں عرشیؔ صاحب نے مرتب اور شائع کیا ہے۔ اس کے اُردو اور فارسی کلام کا انتخاب جو کتاب خانہ رام پور میں محفوظ تھا۔ ان ہی کی کوشش سے منظرِ عام پر آیا۔ غالبؔ کا تمام منظوم اُردو کلام بھی انھیں نے جمع کیا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ساہتیہ اکادمی نے انھیں اس کتاب پر ۱۹۶۱ء میں اپنا انعام دیا تھا۔‘‘

حکومتِ وقت کی طرف سے علمی کاموں کی سرپرستی بجائے خود ایک مستحسن اقدام ہے لیکن اگر یہ نہ بھی ہوتا تو پھر بھی مولانا عرشیؔ کو غالبؔ شناسی میں وہ مقام حاصل ہوتا جس سے دوسرے محروم ہیں۔

اس لیے کہ عظیم لوگ صلہ اور مدح سے بے نیاز ہوا کرتے ہیں۔ مولانا عرشیؔ کی فطری شرافت اور اپنے کام کو عبادت سمجھ کر انجام دینے کی عادت ہی تھی جس کی بدولت وہ آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ اور غالبؔ کی دقیق سے دقیق چیز کو بھی ہم مولانا عرشیؔ کی نگارشات کے ذریعہ بہ آسانی سمجھ لیتے ہیں۔ مولانا عرشیؔ نے تحقیقِ غالب اور تنقید

غالب میں بھی اپنی فطری صلاحیتوں سے اعتدال پسندی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ غالب شناسی کے بارے میں ایک بیان جناب ضیاء الدین اصلاحی کا ہے جو ہمیں ایک مضمون کی صورت میں جناب عرشی زادہ کی وساطت سے موصول ہوا ہے۔ جس میں فاضل مصنف نے بڑی عمدگی سے مولانا کی غالبیات پر تحقیق وتنقید کا جائزہ لیا ہے۔ اس کا ایک اقتباس درج ہے:

> "غالبیات عرشی صاحب کی بحث وتحقیق کا خاص موضوع ہے۔ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے مکاتیب غالب شائع کر کے اردو کے محققین اور غالبیات کے ماہرین کی صف اول میں اپنی جگہ بنالی اور تمام علم ونظر کو اپنی طرف متوجہ کرلیا، اس میں انھوں نے مرزا غالب کے ان خطوط کو جمع کیا تھا جو انھوں نے نواب یوسف علی خان ناظم اور ان کے جانشین نواب کلب علی خان وغیرہ کے نام لکھے گئے تھے۔ عرشی صاحب کے مبسوط مقدمہ اور حواشی نے غالب کے خطوط میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ انتخاب غالب کی اشاعت بھی ان کا اہم ادبی وتحقیقی کارنامہ ہے...... فرہنگ غالب میں مختلف زبانوں کے لفظوں کی تشریحات درج ہیں۔ جو خود غالب نے اپنی کتابوں میں کی تھیں، یہ ۱۹۴۷ء میں چھپی...... وہ زندگی بھر غالب کے متعلق تحقیق وجستجو کرتے رہے اور ان پر درجنوں مضمون (مضامین) بھی لکھے۔ ان کی غالب سے متعلق متعدد کتابیں اور تحریریں ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہیں۔"[۳]

مولانا عرشی کی غالب شناسی کے بارے میں مستند بیانات کے بعد اب مولانا کی نگارشات کا سنین وار تعارف پیش خدمت ہے۔

کتب

۱۔ مکاتیب غالب:

غالب کے وہ خطوط جو انھوں نے والیان رام پور کے نام تحریر کیے تھے، وہ کتب خانہ رضائیہ رام پور میں گرد وغبار میں دفن تھے کہ مولانا عرشی کی نظر ان پر پڑی۔ مولانا نے

انھیں مرتب کر کے شائع کیا۔ بقول مالک رام یہ امر بھی قابلِ تحسین ہے کہ اُن پر کسی اور کی نظر نہیں پڑی ورنہ کوئی اناڑی ڈاکٹر انھیں غلط سلط، چھاپ دیتا۔ ان خطوط کا مکمل تجزیہ اگلے باب میں کیا گیا ہے۔ اس لیے یہاں تعارف کے طور پر اس کی مختلف اشاعتوں پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱۔ مکاتیب غالب: طبع اول: ۱۹۳۷ء: طابع۔ مطبع قیمہ، بمبئی: طباعت نسخ۔
۲۔ مکاتیب غالب: طبع دوم: ۱۹۴۳: طابع: مطبع سرکاری رام پور: طباعت نستعلیق۔
۳۔ مکاتیب غالب: طبع سوم: ۱۹۴۵ء: طابع: ناظم برقی پریس رام پور، طباعت نستعلیق۔
۴۔ مکاتیب غالب: طبع چہارم۔ ۱۹۴۶ء: طابع کا نام درج نہیں ہے۔ طباعت نستعلیق۔
۵۔ مکاتیب غالب: طبع پنجم۔ ۱۹۴۷ء۔ طابع کا نام درج نہیں ہے۔ طباعت نستعلیق۔
۶۔ مکاتیب غالب: طبع ششم۔ ۱۹۴۹ء: طابع کا نام درج نہیں ہے۔ طباعت نستعلیق۔

مکاتیب غالبؔ کے ساتھ ساتھ مولانا عرشیؔ کا مبسوط دیباچہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر ایڈیشن میں مولانا نے تصحیح متن کا بھی خیال رکھا ہے اور مقدمہ اور حواشی میں بھی برابر اضافہ کرتے رہے ہیں گویا یہ خطوط ایک طرح سے غالبؔ کی جیتی جاگتی، ہنستی گاتی اور غموں اور خوشیوں سے ہم کنار ہوتی ہوئی ایک تصویر ہیں۔ چناں چہ مولانا عرشیؔ اس تصویر کے پیش کار کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

۲۔ انتخاب غالب:

غالبؔ شناسی کی روایت کے ارتقا میں مولانا عرشی کا دوسرا اہم کارنامہ انتخاب غالب کی اشاعت ہے۔ یہ ایسی عظیم کاوش تھی کہ حلقۂ ادب میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اس انتخاب کو جس نفاست اور دیدہ زیب انداز میں مولانا نے پیش کیا، اس کے باعث مالک رام کو ''نذرِ عرشیؔ'' میں یہ کہنا پڑا کہ اُردو میں ''شاید اتنی خوب صورت کتاب آج تک نہ چھپی۔''[۳] یہ غالبؔ کا وہ انتخاب ہے جو انھوں نے اپنی زندگی میں بذاتِ خود تیار کر کے والیِ رام پور نواب کلب علی خان کی فرمائش پر ۱۸۶۶ء میں بھیجا تھا۔ یہ کلام بھی لائبریری کے

مخطوطات میں پنہاں تھا۔ اس انتخاب کی طباعت اور فہرست مندرجات اس طرح سے ہے۔

- انتخاب غالب :(از غالبؔ) طابع: مطبع قیمہ، بمبئی: ناشر، رضا لائبریری رام پور۔ طباعت نسخ: سن اشاعت: ۱۹۴۲ء: حجم۔ ۳۴۴ صفحات۔ ترتیب:۔

تمام انتخاب ردیف وار مرتب کیا گیا ہے۔ فارسی کے حصہ غزلیات کی ترتیب اس طرح سے ہے۔

چند رنگین نکتہ دلکش، تکلف بر طرف
دیدہ ام دیوان غالب: انتخابی بیش نیست

ردیف	صفحہ	تا	صفحہ	تعداد اشعار
الف	۳	–	۳۶	۱۳۹
ب	۳۶	–	۳۹	۱۶
پ	۳۹	–	۳۰	۴
ت	۳۰	–	۶۳	۲۰۲
ث	۶۳	–	–	۵
ج	۶۳	–	۶۵	۹
چ	۶۵	–	۶۶	۱۰
ح	۶۶	–	۶۷	۲
خ	۶۷	–	–	۵
د	۶۸	–	۹۹	۱۹۵
ر	۱۰۰	–	۱۰۵	۳۵
ز	۱۰۵	–	۱۰۷	۱۳
س	۱۰۷	–	۱۰۹	۱۴
ش	۱۰۹	–	۱۱۳	۳۰
ص	۱۱۳	–	–	۳
ض	۱۱۵	–	–	۳
ط	۱۱۵	–	۱۱۶	۷
ظ	۱۱۶	–	۱۱۷	۲
ع	۱۱۷	–	۱۱۸	۵
غ	۱۱۸	–	۱۱۹	۴

ف	۱۱۹	–	۱۲۰	۳
ق	۱۲۰	–	–	۳
ک	۱۲۰	–	۱۲۲	۹
گ	۱۲۲	–	–	۲
ل	۱۲۲	–	۱۲۵	۲۱
م	۱۲۶	–	۱۳۲	۱۰۱
ن	۱۳۲	–	۱۵۲	۶۲
و	۱۵۳	–	۱۵۷	۳۶
ہ	۱۵۷	–	۱۶۲	۳۱
ی	۱۶۲	–	۱۷۶	۹۱

تعدادکل اشعار۔ ۱۰۵۶

انتخابِ کلام اُردو:

انتخاب کلام سے پہلے غالب کا مشہور شعر دیا گیا ہے :

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

انتخاب کلام اُردو کی ترتیب ''حصہ غزلیات'' ردیف وار مندرجہ ذیل ہے:

ردیف	صفحہ	تا	صفحہ	تعداد اشعار
الف	۱۸۵	–	۲۰۶	۱۳۹
ب	۲۰۷	–	–	۱
ت	۲۰۷	–	۲۰۸	۸
ج	۲۰۸	–	۲۰۹	۲
د	۲۰۹	–	–	۵

ر	۲۱۰	ـ	۲۱۵	۳۵
ز	۲۱۵	ـ	۲۱۶	۵
س	۲۱۶	ـ	ـ	۳
ک	۲۱۷	ـ	ـ	۴
ل	۲۱۷	ـ	ـ	۲
م	۲۱۸	ـ	ـ	۴
ن	۲۱۸	ـ	۲۳۵	۱۰۶
و	۲۳۵	ـ	۲۴۱	۴۲
ی	۲۴۲	ـ	۲۹۲	۳۱۹

کل اشعار حصہ غزلیات۔ ۳۵۶

تفصیل بابت انتخابِ قصائد:

قصائد	صفحہ	تا	صفحہ	تعداد اشعار کل اشعار منتخب
	۲۹۲	ـ	۳۰۹	

اول قصیدہ : ۷

دوم قصیدہ : ۴

سوم قصیدہ : ۴۶

چہارم قصیدہ : ۳۳

کل تعداد اشعار قصائد : ۹۰

مثنوی در صفت انبہ ۳۳

قطعات :

صفحہ	صفحہ	اشعار کی تعداد
ا۔		۱۷
۲۔		۲
۳۔		۲
۴۔		۲
۵۔		۲
۶۔		۱۳
۷۔		۲
	کل اشعار =	۴۰

رباعیات :

اشعار

کل ۵ رباعیات =۱۰ (۲۰) مصرع۔

دیباچہ:

انتخاب کلام کی تفصیلات کے بعد "دیباچہ" کے اُن اہم نکات کا مطالعہ ضروری ہے جن میں کلامِ غالب کے ماخذات اور اس کے فنی پہلوؤں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

انتخاب فارسی:

مولانا عرشی نے غالب کا یہ انتخاب تجزیاتی انداز میں اس طرح پیش کیا ہے:

"......فارسی انتخاب 11.5 × 7.5 انچ کے نام کے ۸۳ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس کا سطر ۱۷ سطری ہے۔ لیکن ہر غزل کے ختم پر دوسری کے عنوان

کے خیال سے ایک سطر سادہ چھوڑ دی گئی ہے۔ روشنائی اور کاغذ اُردو انتخاب جیسا ہے۔ انداز تحریر کے اختلاف سے معلوم ہوتا ہے کہ تین کاتبوں نے مل کر اسے نقل کیا ہے۔ چناں چہ صفحہ ۱۔۴ ایک شخص کا خط ہے۔ اس کے بعد ص ۵ تا ص ۹ خود میرزا صاحب کا قلم ہے۔ اور پھر ص ۱۰ تا ۱۴ پہلے کاتب کا، اور ص ۱۵ تا آخر تیسرے شخص کا ہے۔ اس حصہ کی نقل میں بھی کاتبوں نے غلطیاں کی تھیں وہ بعد میں میرزا صاحب نے اپنے قلم سے درست کردی ہیں۔" [4]

انتخابِ فارسی کا ماخذ:

مولانا عرشی کے خیال میں فارسی کلام کی بنیاد کلیات فارسی نول کشوری ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۶۳ء پر رکھی گئی ہے۔ اس لیے کہ طرزِ کتابت کی یک سانی کے علاوہ۔ اس انتخاب کی آٹھویں رباعی صرف اسی کلیات میں موجود ہے۔

مقدارِ انتخاب:

فارسی انتخاب غزلوں اور رباعیات پر ہی مشتمل ہے۔ مولانا عرشی کے مطابق مذکورہ بالا مطبوعہ نسخہ میں غزلوں کے اشعار کی تعداد ۳۶۰۶ اور رباعیات کی تعداد ۲۰۸ ہے، ان میں سے ۱۰۶۰ شعر غزلوں کے اور ۱۸ رباعیاں انتخاب کی گئی ہیں۔

انتخابِ اُردو:

غالب نے نواب کلب علی خان کی فرمائش پر اپنا انتخاب خاص طور سے اپنی نگرانی میں مرتب کیا اور نواب موصوف کی خدمت میں بھیجا۔ اس انتخاب کی تفصیل کے باب میں مولانا عرشی لکھتے ہیں:

"اُردو انتخاب $12\frac{1}{4} \times 7\frac{3}{4}$ انچ ناپ کے ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان صفحوں کی سطروں کی تعداد مختلف ہے۔ کہیں ۱۳ اور کہیں اس سے

زیادہ ۱۶ اتک ہیں۔ کاغذ یورپ کی ساخت کا باریک ہے۔ متن کی روشنائی سیاہ اور عنوانات سرخ ہیں۔ قلم اول سے آخر تک ایک ہے۔ خط بہت معمولی نستعلیق اور اس قدر اغلاط سے پر ہے کہ میرزا صاحب کی تصحیح کے باوجود باقی ماندہ غلطیاں اصلاحوں سے زیادہ نظر آتی ہیں۔

ہر نئی غزل کے پہلے مصرع کے شروع میں سرخ لکیر کھینچی گئی ہے تا کہ سابق ولاحق میں امتیاز پیدا ہو جائے۔ ۴۸ صفحوں تک کسی نے صفحہ شماری بھی کی ہے۔ عرصہ دراز تک۔ ''ردی گھر'' میں پڑا رہنے کے باوجود اوراق میں بہت معمولی سی کرم خوردگی اور کسی قدر کہنگی پیدا ہوئی ہے۔''۵

مآخذ انتخاب اُردو:

مولانا عرشی کی تحقیق کے مطابق غالب نے اس انتخاب کی نقل مطبع نظامی کانپور کے چھپے ہوئے نسخے سے کروائی ہے۔ اپنے اس بیان کو بھی مولانا عرشی نے دیباچہ میں ثابت کیا ہے۔

مقدار متن :

مولانا کے بیان کردہ اندازے کے مطابق نظامی ایڈیشن کے ابیات کی تعداد ۱۷۹۹ ہے جن میں غزلوں کے ۱۴۵۷ اشعار، ۱۶۲ شعر قصائد کے، ۱۱۵ قطعات کے، ۳۲ رباعیات کے اور باقی ۲۵ مثنوی ''انبہ'' کے ہیں۔

غالب نے انتخاب کے وقت مثنوی انبہ مکمل چن لی ہے۔ قطعات کے ۴۰ شعر، قصیدوں کے ۹۲، اور غزلیات کے ۶۷۲ اشعار، رباعیات کے ۱۰ اشعر منتخب کیے ہیں۔ اس طرح مجموعی تعداد ۸۳۸ ہوتی ہے۔

دیباچہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ مولانا عرشی نے اس میں تحقیق کے ساتھ تنقید کا پہلو بھی شامل کیا ہے۔ اپنی محققانہ ژرف نگاہی سے کلام غالب کی بعض فنی خصوصیات

کا بھی جائزہ لیا ہے۔ غالبؔ کے فنی ذوق کی داد دیتے ہوئے مولانا کا موقف یہ ہے کہ اس اعلا ذوق کی جھلک ان کے انتخاب میں بھی نظر آتی ہے۔ غالبؔ کے شعری معیار کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عرشیؔ لکھتے ہیں:

''میرزا صاحب کے نزدیک اچھے شعروں میں لفظاً، سلاست و متانت الفاظ، پاکیزگی و صفائی روزمرہ، ندرت دل پسندی، بندش اور حسنِ بیان اور معنیً، بلندیٔ خیال، نزاکت معنی، عمدگی مضمون اور سلاست و تازگی فکر ہونا چاہیے۔ اسی کا نام شیوہ بیانی ہے اور یہی خوبیاں کلام کو سہل ممتنع بناتی ہیں۔''[۶]

مندرجہ بالا بیان غالبؔ کے فنی نقطۂ نظر کا ترجمان ہے اور مذکورہ انتخاب غالبؔ اسی معیار پر پورا اترتا ہے۔

مولانا عرشیؔ نے اس متن کی تصحیح کے لیے جن نسخوں سے استفادہ کیا ہے۔ آخر میں ان کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی ہیں۔ ایک محقق کا حق ادا کرتے ہوئے مولانا عرشیؔ نے آٹھ مطبوعہ نسخوں کو حوالہ تحریر کیا ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ ستمبر ۱۸۶۶ء کا غالبؔ کا اپنے ہاتھ کا انتخاب۔

۲۔ مئی ۱۸۵۷ء کا وہ قلمی نسخہ جسے مرزا نے نواب فردوس مکان کے حضور بذریعہ ڈاک ارسال کیا۔

۳۔ اکتوبر ۱۸۴۱ء شعبان ۱۲۵۷ھ کا وہ نسخہ جو سرسید کے بھائی سید محمد خان بہادر کے مطبع سے شائع ہوا۔

۴۔ مئی ۱۸۴۷ء (۱۲۶۳ھ) میں مطبع دارالسلام، دہلی سے چھپنے والا نسخہ۔

۵۔ ۱۸۶۱ء، ۲۰ محرم ۱۲۷۸ھ کو دہلی میں مطبع احمدی میں شائع شدہ۔

۶۔ ۱۲۷۸ھ کان پور کے مطبع نظامی سے شائع شدہ نسخہ موجود انتخاب اسی سے نقل ہے۔

۷۔ ۱۸۶۳ء میں منشی شیونرائن کے مطبع مفید خلائق آگرہ سے چھپا ہوا نسخہ۔

۸۔ ۱۹۲۳ء میں نظامی پریس بدایوں سے چھپنے والے دیوان کا نسخہ۔

مولانا عرشی کے مرتبہ اس انتخابِ غالب کا دوسرا ایڈیشن ان کے جیتے جی شائع نہیں ہو سکا۔

۳۔ فرہنگِ غالب:

طابع: ناظم برقی پریس، رام پور: ناشر۔ منیجر اشاعت خانہ، رام پور۔

طباعت: نستعلیق۔ طبع اول۔ ۱۹۴۷ء۔ حجم = ۳۰۶ صفحات۔

غالبؔ کی زندگی میں لغت کے سلسلہ میں جو معرکہ پیش آیا وہ غالبؔ کے مطالعہ کرنے والوں سے کسی طرح پوشیدہ نہیں ہے۔ غالبؔ نے ہمیشہ اہل زبان کو ہی سند کے طور پر تسلیم کیا اور ہندستانیوں کو وہ اس فن سے نابلد تصور کرتے تھے۔ اسی لیے ان کے فن لغت پر بھی انھیں ہمیشہ اعتراض رہا ہے۔ قاطع برہان، کا جھگڑا ایسی پس منظر لیے ہوئے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غالب کو اپنی فارسی دانی پر بڑا ناز تھا اور وہ بڑی حد تک بجا بھی تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنے احباب کو دقیق سے دقیق الفاظ اور مسائل کے بارے میں آسان سے آسان پیرائے میں سمجھاتے ہیں۔ ان کی مختلف اصناف اور تصنیفات میں بے شمار الفاظ کے معنی اور مطالب درج ہو گئے ہیں۔ مولانا عرشی نے پہلی مرتبہ ان تمام علمی معلومات کو یکجا کر کے فرہنگِ غالب کے نام سے مرتب کیا۔ جو لغت نویسی کی روایت میں ایک بیش بہا اضافہ ثابت ہوا۔ اس کے دیباچہ میں مولانا عرشی نے ہندستانی لغت نویسوں کے کام کا بھی جائزہ لیا ہے۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۷ء میں چھپا۔ لیکن بعد میں بھی یہ لغت طباعت کے زیور سے آراستہ ہوتی رہی ہے۔ اس کی حالیہ اشاعت کا ایک نسخہ بھارت سے جناب صابر حسین صابر سنبھلی نے ارسال کیا ہے۔ موصوف نے بھارت میں مولانا عرشی پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے کام کیا ہے۔ اس کی اشاعت تقسیم کار کے اختیار سے ہوئی ہے۔ اور ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نمبر ۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی سے یہ چھپی ہے۔ مندرجہ ذیل

اہم معلومات کے سلسلہ میں اس ایڈیشن سے استفادہ کیا گیا ہے۔

پیشکش: کے عنوان سے شروع میں مولف نے ایک شعر درج کیا ہے:

حضور کسی کہ ذوق مرا
آفریں گفت و شاد مانم کرد

ترتیب کتاب:

مضامین

دیباچہ

دیباچہ کے شروع میں مولانا عرشیؔ نے ہندستان کے فارسی گویوں کا ذکر کیا ہے اوران کے کاموں کو سراہا ہے بالخصوص فارسی زبان کی لغت کے سلسلے میں ان اکابرین نے جو خدمات انجام دیں مولانا عرشیؔ نے ان کے نام گنوا کر انھیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ البتہ فارسی کے اہلِ زبان سے انھیں گلا ہے کہ ان لوگوں نے ہمارے اکابرین کی خدمات کا حقیقی معنوں میں اعتراف نہیں کیا۔

ہندستان کے فارسی گو حضرات اور قواعدِ فارسی کے اساتذہ کے بارے میں معلومات کے علاوہ اس دیباچہ میں لغاتِ فارسی کے ضمن میں نام ور محققین کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ فارسی کو چند مشہور لغات اوران کے لکھنے والوں کے نام بھی پیش کیے گئے ہیں۔ مولانا عرشیؔ فارسی زبان وادب کے بارے میں ان خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان کتابوں کے مرتب کرنے والوں نے اپنی عزیز عمر الفاظ کی تحقیق و تلاش میں صرف کی۔ لغت کی پچھلی کتابوں کے علاوہ، نظم ونثر کی کتابوں کے ہزارہا صفحات کی ورق گردانی کر کے الفاظ ومحاورات کا ذخیرہ جمع کیا، اور ایک ایک لفظ کے تلفظ اور معنی اور ہر ہر محاورے کی حقیقت اور محلِ استعمال کا کھوج لگا کر آنے والی نسلوں کے لیے عظیم الشان ذخیرہ چھوڑ گئے۔''

مولانا عرشیؔ نے ان فرہنگ نویسوں کو زمانی اعتبار سے دیباچہ میں متعارف کرایا ہے اوران کی خدمات کا ایک واضح نقش اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا عرشیؔ نے ان ہی لغت نویسوں میں خان آرزو اور ٹیک چند بہار کے بعد مرزا غالبؔ کو پیش کیا ہے اور غالبؔ کی فارسی کے سلسلہ میں فطری مناسبت کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا عرشیؔ کا یہ موقف ہے کہ غالبؔ کو اپنے عہد کے علما اور ادبا میں اس لیے نشانۂ تضحیک بننا پڑا کہ غالبؔ کا انداز اور طرز کار ذرا متانت وتہذیب سے گرا ہوا تھا۔ جو ہندستانی ادیب برداشت نہ کر سکے۔ اسی بنا پر

غالبؔ کی مخالفت شدت اختیار کر گئی اور بقول مولانا عرشؔی:

"ملک کے گوشے گوشے سے ان کے خلاف ترکی بہ ترکی نہیں، ترکی بہ پشتو کا سلسلہ جاری ہو گیا۔"[۸]

اس مخالفت کے تحت یہ ستم ظریفی ہوئی کہ غالبؔ کا یہ علمی کام جو ایک اعلا ادبی کارنامہ تھا وہ مخالفت کی گرد میں دب کر رہ گیا۔ مولانا عرشؔی نے سب سے پہلے یہ پہلو قابلِ اعتنا سمجھا اور غالبؔ کے قاطع برہان کے سلسلے میں جتنے الفاظ تھے انھیں ہجی ترتیب سے جمع کر کے ایک کتاب بنادی۔ مولانا عرشؔی کا اس سلسلے میں بیان ہے:

"الحمد للہ کہ چند مہینوں کی کنج کاری سے یہ مجموعہ مرتب کیا۔ چوں کہ اس کا ہر ہر لفظ غالبؔ ہی کا تراویدہ قلم تھا، میں نے اس کا نام فرہنگِ غالب تجویز کیا ہے۔"[۹]

کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ فارسی الفاظ کی شرح میں ہے اور دوسرا اُردو الفاظ پر مشتمل ہے۔ ہر لفظ کی تشریح کے بعد قوسین میں ان کتابوں کے رموز لکھ دیے جن سے استفادہ کیا گیا ہے۔ دیباچہ کی اہمیت اس میں بھی ہے کہ ضروری ماٰخذ کی تشریح کے لیے مولانا نے جو حوالے پیش کیے ہیں ان کی مدد سے غالبؔ کی تصانیف سے ثبوت پیش کیے جا سکتے ہیں۔ لغت کی اصطلاحات کے انداز میں غالبؔ کی تصانیف کے پہلے حرف کو قوسین میں درج کر دیا ہے۔ مثلاً :

"س سے مراد سبد چین، ع سے مراد عود ہندی، بر سے مراد ابر گہر بار ہے وغیرہ وغیرہ"۔

حواشی واعراب:

کے عنوان سے دیباچہ میں اس کتاب کو مرتب کرتے وقت مولانا نے غالبؔ کے اعراب کو بھی پیش کر دیا ہے یا جس جگہ غالبؔ نے اعراب نہیں لگائے ان کی یا تو تائید یا توثیق بھی کر دی ہے۔

معذرت وشکریہ: کے عنوان کے تحت آخر میں مولانا عرشی نے کہا ہے کہ اس کے مطالعہ کے دوران اگر قاری کو دقت محسوس ہو تو سمجھ لیجیے کہ اس پر میری نظر نہیں پڑی البتہ یہ کمزوری آئندہ طباعت میں دور کر دی جائے گی۔

اس کے ساتھ ساتھ مولانا عرشی نے جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی طرف سے ''درفش کاویانی'' کا عطیہ پیش کرنے پر شکریہ ادا کیا ہے۔ مقدمہ کے آخر میں اس کی تاریخ ۳۰ جون ۱۹۳۶ء لکھی گئی ہے۔

۴۔ دیوان غالب۔ نسخہ عرشی :

غالب شناسی کی روایت میں مولانا عرشی کو شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں مسند خاص پر بٹھانے والا تحقیقی کام دیوانِ غالب کی ترتیب اور تدوین ہے۔ اسے انجمن ترقی اُردو ہند کا ایک بڑا کارنامہ تصور کرنا چاہیے۔

دیوان غالب نسخہ عرشی : طبع اول ۱۹۵۸ء ناشر۔ انجمن ترقی اُردو، ہند، علی گڑھ۔ مطبع۔ ہندستان پرنٹنگ ورکس، رام پور۔ طباعت تخ۔ حجم۔ ۶۳۲ صفحات۔

اس نسخہ میں غالب کا تمام اُردو کلام تاریخی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس نسخے کی بنیاد غالب کے خود لکھوائے ہوئے ۱۸۵۷ء کے اس نسخہ پر ہے جو انھوں نے نواب فردوس مکان یوسف علی خان متخلص بہ ناظم کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ مکاتیب غالب کی طرح اس کی تدوین میں بھی مولانا عرشی کا مبسوط مقدمہ اور آخر میں حواشی موجود ہیں۔ اس ایڈیشن کا تعارف، تقریب کے عنوان سے انجمن ترقی اُردو ہند۔ علی گڑھ کے سیکرٹری جنرل جناب آل احمد سرور کی تحریر ہے۔ اس تقریب میں موصوف اس نسخہ کے بارے میں اپنے بصیرت افروز علمی و ادبی خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ :

> ''زیر نظر ایڈیشن، جو اُردو کے مشہور محقق اور غالبیات کے ماہر جناب امتیاز علی خان عرشی کی برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ نہ صرف ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے بلکہ کلام کی تاریخی ترتیب اور صحت، نسخوں کے اختلافات

کی نشان دہی شرح اور ضروری حواشی کے لحاظ سے اب تک کی ساری کاوشوں پر بھاری اور اُردو میں اَدبی تحقیق اور عالمانہ نظر کا ایک قابل فخر اور ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔"[۱۰۰]

جناب آل احمد سرور نے مولانا عرشؔی کی کاوشوں کو جس انداز میں سراہا ہے اس سے کوئی بھی اختلاف نہیں کر سکتا۔ اس نسخہ کا تجزیاتی مطالعہ مقالہ ہٰذا کے آئندہ باب میں پیش کیا گیا ہے۔ اس دیوان کا ایک ایڈیشن بھارت سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کی دوسری طباعت کا تعارف اس طرح سے ہے۔

دیوان غالب ۔ نسخۂ عرشی :طباعت نخ: ناشر۔ انجمن ترقی اُردو، ہند، دلی۔ طبع دوم ۔۱۹۸۲ء۔

مضامین عرشؔی بسلسلہ غالبؔ:

مولانا عرشؔی نے غالبیات کے نادر ذخیرہ میں ایک طرف اعلا اور معیاری کتب کو مرتب کر کے اضافہ کیا تو دوسری طرف ملک کے مایہ ناز علمی و ادبی رسائل و جرائد میں اپنے مضامین و مقالات کے ذریعے غالب شناسی کی روایت کو مستحکم کیا۔ ذیل میں ان کے شائع شدہ مضامین کی ایک فہرست پیش کی جا رہی ہے۔ علاوہ ازیں مولانا عرشؔی کے دستیاب شدہ مضامین کا خلاصہ آئندہ باب میں پیش کیا گیا ہے۔

۱۔ خمار رسوم و قیود۔

ماہ نامہ "نیرنگ" رام پور، جولائی ۱۹۲۶ء، جلد ۲، شمارہ ۷، ص ۱۱، ۱۲۔

۲۔ میرزا غالبؔ کی ایک معروف فارسی مثنوی۔

ماہ نامہ، نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۴۱ء جلد ۳۹، شمارہ ۵۰، ص ۹ تا ۱۲۔

ترجمہ منظوم دعاء الصباح، غالبؔ کی ایک نادر مثنوی، مخطوطہ، رام پور۔

ماہ نامہ نیا دور، لکھنؤ، فروری/مارچ ۱۹۶۹ء، جلد ۲۳، شمارہ ۱۱۔۱۲، ص ۱۸ تا ۲۳۔

نوٹ:۔ یہ مضمون مندرجہ بالا دو الگ الگ عنوانات سے شائع ہوا ہے۔

۳۔ دیوان غالب اُردو کے ابتدائی نسخے۔

ماہ نامہ "جامعہ" نئی دلی، مئی ۱۹۴۲ء، جلد ۳۷، شمارہ ۲، ص ۱۴۶ تا ۱۶۳۔

نوٹ:۔ یہ مضمون دیوانِ غالب نسخہ عرشی طبع ثانی میں مقدمے کے صفحہ ۱۲۷ تا ۱۴۴ بھی موجود ہے۔

۴۔ تدوین اشعار غالب۔

ماہ نامہ "معین الادب" لوہارو بابت جون ۱۹۴۴ء، جلد ۱، شمارہ ۱، ص ۳۹ تا ۴۲۔

۵۔ دیوانِ غالب نسخہ حمیدیہ کے چند اغلاط۔

مجلّہ عثمانیہ۔ حیدرآباد ۱۹۴۵ء، جلد ۱۷، شمارہ ۱، ص ۷ تا ۱۳۔

الف) نسخہ حمیدیہ کی فروگزاشتیں (نسخہ بھوپال کی روشنی میں)

ماہ نامہ "نیا دور" لکھنؤ، مئی ۱۹۶۹ء، جلد ۲۵، شمارہ ۲، ص ۳ تا ۱۴۔

ب) نسخہ حمیدیہ کے اغلاط نسخہ بھوپال کی روشنی میں۔

سہ ماہی صحیفہ۔ لاہور غالب نمبر، سوم، جولائی ۱۹۶۹ء، جلد ۱۲، شمارہ مسلسل ۱ تا ۲۸، ۴۸ صفحات۔

نوٹ:۔ یہ مضمون تین الگ الگ عنوانات سے شائع ہوا۔ بعد والی اشاعتوں میں بہت زیادہ اضافے کیے گئے۔

۶۔ غالب کی شعرگوئی اور ان کے دواوین۔

علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۴۹۔ ۱۹۴۸ء، جلد ۲، شمارہ ۲، صفحات ۱۰۵ تا ۱۲۲۔

۷۔ میرزا غالب کی تعلیم تحقیق اور اجتہاد کے دوراہے پر۔

ماہ نامہ "فاران" کراچی، ستمبر ۱۹۴۹ء۔

۸۔ غالب کے فارسی خطوط ایک نئی تحقیق۔

ماہ نو، کراچی، فروری ۱۹۵۰ء۔

جنوری / فروری ۱۹۶۹ء، جلد ۲۲، شمارہ ۱، ۲، صفحات ۱۹۷ تا ۲۰۴۔

۹۔ غالبؔ کی اپنے کلام پر اصلاحیں۔

ماہ نامہ ''آجکل'' دلی، فروری ۱۹۵۲ء۔

آئینۂ غالبؔ، شائع کردہ پبلی کیشنز ڈویژن، دلی، طابع گورنمنٹ آف انڈیا پریس، فرید آباد، ۱۹۶۳ء، ص ۶۶ تا ۷۷۔

۱۰۔ کچھ غالبؔ سے متعلق۔

ماہ نامہ ''آجکل'' دلّی، فروری ۱۹۵۷ء۔

مہر نیم روز، کراچی، فروری ۱۹۵۸ء، جلد ۳، شمارہ ۲، صفحات ۱۷، ۱۸۔

غالبؔ اور خزاں نا مشخص۔

ماہ نامہ ''آجکل'' دلی، مارچ ۱۹۷۲ء، غالبؔ نمبر، جلد ۳۰، شمارہ ۸، صفحات ۱۰، ۱۱۔

سہ ماہی ''غالب'' کراچی، جنوری ۱۹۷۶ء، جلد ۲، شمارہ ۱، ص ۱۷ تا ۲۱۔

نوٹ:۔ یہ مضمون مندرجہ بالا عنوانات سے چار بار شائع ہوا ہے۔

۱۱۔ غالبؔ کا دربار اور خلعت۔

ہفتہ وار ''دورِ جدید'' دلی، اُردو نمبر ۲۵ راگست ۱۹۵۷ء، ص ۱ تا ۳۷۔

ماہ نو کراچی، جنوری / فروری ۱۹۶۹ء، جلد ۲۲، شمارہ ۱، ۲، صفحات ۲۸۰، ۲۸۳، ۲۸۸۔

ماہ نامہ ''شاعر'' بمبئی، فروری / مارچ ۱۹۶۹ء، غالبؔ نمبر، جلد ۴۰، شمارہ ۲، ۳، ص ۲۱۳ تا ۲۱۷۔

۱۲۔ غالبؔ اور برہانِ قاطع۔

ماہ نامہ ''آجکل'' دلی، مارچ ۱۹۵۸ء، جلد ۱۶، شمارہ ۸، ص ۳ تا ۱۲۔

آئینۂ غالبؔ، صفحات ۱۹۱ تا ۲۱۳۔

۱۳۔ غالبؔ کی چند نئی اُردو تحریریں۔

ماہ نامہ ''شاعر'' بمبئی، خاص نمبر، مارچ / اپریل ۱۹۵۹ء، جلد ۳، شمارہ ۳، ۴۔ صفحات ۳۳ تا ۳۶۔

۱۴۔ میرزا کی کچھ نئی فارسی تحریریں۔

"اُردوئے معلّیٰ" دلی بابت فروری ۱۹۶۰ء، جلد ۱، شمارہ ۱، صفحات ۱۰ تا ۳۹۔

۱۵۔ دیوانِ غالبؔ کا ایک نادر مخطوطہ۔

ماہ نامہ "نقوش" لاہور، جون ۱۹۶۰ء۔

"ذوالقرنین" بدایوں، ۲۱ر جولائی ۱۹۶۰ء، شمارہ دستیاب نہیں ہوا۔

ماہ نامہ "نیا دور" لکھنؤ، جنوری ۱۹۷۱ء، جلد ۲۶، شمارہ ۱۱، ص ۳ تا ۶۔

(دیوان غالبؔ نسخہ بدایوں ایک مخطوطہ)

ماہ نامہ "تحریک" دلی، اپریل / مئی ۱۹۶۱ء، جلد ۹، شمارہ ۱، ۲، ص ۹ تا ۲۹۔

"مانگے کا اُجالا" (دیوان غالبؔ نسخہ بدایوں) دیوان غالب نسخہ عرشی طبع ثانی

دیباچہ ص ۱۰۶ تا ۱۱۱ (نسخہ بدایوں)

نوٹ:۔ بعد کی تینوں اشاعتوں کے عنوانات سامنے قوسین میں درج ہیں:

۱۶۔ غالبؔ کا معیارِ سخن (اقتباسات از دیوان غالب نسخہ عرشی)

ماہ نامہ "نگار" لکھنؤ، جنوری ۱۹۶۱ء، غالبؔ نمبر، جلد ۴۰، شمارہ، ص ۸۹ تا ۱۰۱۔

۱۷۔ غالبؔ اور برہان۔

ماہ نامہ "تحریک" نئی دلی، اپریل / مئی ۱۹۶۱ء، جلد ۹، شمارہ ۱، ۲۔ ص ۹ تا ۲۹۔

ماہ نامہ "تحریک" نئی دلی، اپریل ۱۹۸۱ء، ج ۲۹، شمارہ ۱، صفحات ۲۰ تا ۳۱۔

۱۸۔ نسخہ حمیدیہ اور بجنوری۔

ماہ نامہ "نیا دور" لکھنؤ، مئی ۱۹۶۱ء، جلد ۱۶، شمارہ ۲، صفحات ۵ تا ۸۔

۱۹۔ دیوانِ غالب اُردو (نسخہ عرشی)

ماہ نامہ "نقوش" لاہور، نومبر ۱۹۶۳ء۔

"اُردو تحقیق اور مالک رام" مرتبہ: شاہد اعظمی، ناشر، ادارہ تحقیق، دلی، ۱۹۷۵ء،

صفحات ۱۳۵ تا ۱۵۷۔

۲۰۔ غالب اور قاطع برہان ۔ چند غیر مطبوعہ تحریریں۔

ماہ نامہ ''نیا دور'' لکھنؤ، جنوری ۱۹۶۵ء، جلد ۲۰، شمارہ ۱۱، صفحات ۵ تا ۱۲۔

۲۱۔ غالب کی نئی فارسی تحریریں۔

''ماہ نو'' کراچی، مارچ ۱۹۶۵ء، جلد ۱۸، شمارہ ۳، صفحات ۶۵ تا ۷۳ و ۱۳۱۔

ایضاً، جنوری ۱۹۶۹ء، صفحات ۲۳۳ تا ۲۳۴۔

۲۲۔ برہان قاطع پر غالب کے چند اعتراضات کا ایک جائزہ۔

ماہ نامہ ''نیا دور'' لکھنؤ، جنوری ۱۹۶۷ء، جلد ۲۲، شمارہ ۱۰، صفحات ۱۰ تا ۱۷۔

۲۳۔ غالب کی چند نئی فارسی تحریریں۔

ماہ نامہ ''ماہ نو'' کراچی، فروری ۱۹۶۷ء، جلد ۲۰، شمارہ ۲، صفحات ۹، ۱۲، ۱۳، ۲۰۔

ایضاً، جنوری/فروری ۱۹۶۹ء، جلد ۲۲، شمارہ ۱، ۲، صفحات ۲۴۳، ۲۵۵۔

۲۴۔ مرزا غالب کا زائچہ۔

ماہ نامہ ''آجکل'' دلی، فروری ۱۹۶۷ء، جلد ۲۵، شمارہ ۷، ص ۷ تا ۱۱۔

''ماہ نو'' کراچی، فروری ۱۹۶۹ء، جلد ۲۲، شمارہ ۱۔۲، صفحات ۴۳ تا ۴۷۔

۲۵۔ سبد باغ دو در۔

سہ ماہی ''اُردو'' کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء، جلد ۴۵، شمارہ ۱، ص ۲۹۳ تا ۵۳۰۔

نوٹ:۔ انجمن ترقی اُردو، پاکستان نے اس کو ۱۹۶۹ء میں کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔

۲۶۔ مقدمہ دیوانِ غالب فارسی (مرتبہ عرشی) کے چند اوراق۔

ماہ نامہ ''شاعر'' بمبئی، فروری/مارچ ۱۹۶۹ء، جلد ۴۰، شمارہ ۲۔۳، (غالب نمبر)، صفحات ۵۲۰ تا ۵۲۹۔

۲۷۔ غالب کا خود نقل کردہ نسخہ دیوان اُردو۔

ماہ نامہ ''آجکل'' دلی، بابت جولائی ۱۹۶۹ء، جلد ۲۷، شمارہ ۱۳، صفحات ۳ تا ۶۔

۲۸۔ غالبؔ کا ایک نادر انتخاب۔
ماہنامہ ''نقوش'' لاہور، اکتوبر ۱۹۶۹ء، غالبؔ نمبر حصہ سوم۔

۲۹۔ مجلسِ یادگارِ غالب کا شائع کردہ دیوانِ غالبؔ۔
ماہنامہ ''تحریک'' دلی، اپریل ۱۹۷۴ء، جلد ۲۲، شمارہ ۱، ص ۱۳ تا ۲۱۔

۳۰۔ قاطع برہان کا پہلا مسودہ۔
''نذرِ عابد'' مرتبہ: مالک رام، ناشر: مجلس نذرِ عابد، دلی ۱۹۷۴ء، طابع جمال پرنٹنگ پریس، دلی، صفحات ۱۸۱ تا ۲۱۸۔

۳۱۔ برہان قاطع پر غالبؔ کے چند اعتراضات کی ایک قسط۔
ماہنامہ ''تحریک'' دلی، فروری ۱۹۷۵ء، جلد ۲۱، شمارہ ۱۱، ص ۱۳ تا ۱۷۔

۳۲۔ اردو شاعری پر غالبؔ کا اثر۔
ماہنامہ ''فاران'' کراچی، اپریل ۱۹۴۹ء، جلد ۱، شمارہ ۳، صفحات ۱۹۔۲۰۔
ماہنامہ ''نیا دور'' لکھنؤ، مارچ ۱۹۵۹ء، جلد ۱۳، شمارہ ۱۲، صفحات ۵ تا ۸۔
میگزین ایف۔ آر۔ اسلامیہ انٹر کالج، بریلی، غالبؔ نمبر ۱۹۷۰ء، ص ۱۷ تا ۲۴۔

دیگر:

۱۔ کلامِ غالبؔ کا انتخاب کس نے کیا؟
ماہنامہ ''تحریک'' دلی، غالبؔ نمبر، اپریل / مئی ۱۹۶۱ء، جلد وشمارہ ۱۔۲، ص ۹۳۔

۲۔ دیوانِ غالب ''نسخۂ حمیدیہ'' کی اشاعت کا سال۔
ہفتہ وار ''ہماری زبان'' دلی بابت ۱۸/اگست ۱۹۶۱ء، جلد ۲۰، شمارہ ۳۰، ص ۷۔

۳۔ غالبؔ کے متعلق مولانا عرشی کے تیرہ خطوط۔
ماہنامہ ''نیا دور'' لکھنؤ، مئی ۱۹۶۷ء، جلد ۲۳، شمارہ ۲، صفحات ۳ تا ۱۲۔

۴۔ میرزا غالبؔ کی تاریخ پیدائش۔

ماہ نامہ "تحریک" دلی، اگست ۱۹۶۹ء، جلد ۱۷، شمارہ ۵، صفحہ ۱۳۔

"قومی آواز" کراچی، ستمبر ۱۹۶۹ء، جلد ۳۵، شمارہ ۳، صفحہ ۱۷۔

ہفتہ وار "ہماری زبان" علی گڑھ، بابت ۱۵/ اپریل ۱۹۷۴ء، جلد ۳۳، شمارہ ۱۵، ص ۶۔

یہ تو تھی ابھی تک مولانا عرشی کے مقالات اور مضامین کی دریافت شدہ فہرست۔ لیکن اس کو تا حال مکمل نہیں تصور کیا جا سکتا۔ اب بھی مولانا عرشی کے ذخیرۂ علمی میں غالبؔ سے متعلق بیش بہا لعل و جواہر موجود ہیں۔ اب یہ اہلِ نظر کا کام ہے کہ انھیں منظرِ عام پر لائیں۔ ذیل میں رسائل کا تذکرہ پیشِ خدمت ہے۔ جن میں مولانا عرشی کے مرتبہ مکاتیبِ غالب کے لیے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

مکتوبات:

نقوش، لاہور "خطوط نمبر" حصہ سوم۔

نقوش، لاہور "مکاتیب نمبر" حصہ دوم۔

شب خون، الٰہ آباد، فروری ۱۹۷۵ء۔

۱۔ پیش لفظ مرقع غالبؔ مرتبہ پرتھوی چند۔

۲۔ غالبؔ پر ایک گفت گو (ریڈیو سے نشر ہوئی تھی)

سرگزشت غالب (مسودہ شائع ہونے سے قبل ہی ضائع ہو گیا تھا)۔

دریافتیں:

۱۔ فارسی کلام (الف) یک روز تبرک بادہ گوئی غالبؔ (رباعی)

(ب) اے دادہ بیاد عمر در بوالہوس (رباعی)

ماہ نامہ "نیرنگ" دلی، اپریل/ مئی ۱۹۳۴ء، جلد ۲۵، شمارہ ۴_۵، صفحہ ۲۶۳۔

۲۔ مرزا غالبؔ کے تین غیر مطبوعہ خطوط (منشی سیل چند کے نام)

"معیار" پٹنہ، مارچ ۱۹۳۶ء، جلد ۱، شمارہ ۱، ص ۱۵۔

۳۔ غزل میرزا غالب ماخوذ از دیوانِ معروف (اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں)۔
ماہنامہ "نیرنگ" دلی، جنوری / فروری ۱۹۳۴ء، ص ۲۲۔

حواشی

۱۔ راقم الحروف کے نام جناب عرشی زادہ کا مکتوب۔ تاریخ درج نہیں ہے۔ موصولہ نومبر ۸۳ء۔

۲۔ اقتباس از مضمون۔ مولانا امتیاز علی خان عرشی۔ مرقومہ، جناب ضیاء الدین اصلاحی۔ مرسلہ۔ جناب عرشی زادہ۔ بنام راقم الحروف، موصولہ ۸۳ء

۳۔ نذرِ عرشی: مالک رام۔ ص: مطبوعہ جمال پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۶۵ء

۴۔ مولانا عرشی۔ دیباچہ انتخاب غالب۔ ص کھ۔

۵۔ دیباچہ انتخاب غالب۔ مولانا عرشی (ص کا۔ کب)

۶۔ دیباچہ انتخاب غالب۔ مولانا عرشی، ص

۷۔ دیباچہ، فرہنگِ غالب، مولانا عرشی، طبع اول، ۱۹۴۷ء، مطبع ناظم برقی پریس، رام پور۔ ص ۱۶۔

۸۔ ایضاً، ص ۱۹۔

۹۔ دیباچہ فرہنگ غالب، مولانا عرشی۔ ص ۲۱۔

۱۰۔ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی۔ تقریب۔ آل احمد سرور، ص ۷۔

◆◆◆

چوتھا باب

مکاتیبِ غالبؔ کی جمع و تدوین اور مولانا عرشیؔ

◆◆

مرزا نے اُردو مکتوب نگاری کا آغاز انیسویں صدی کے وسط میں کیا مگر آج اکیسویں صدی ربع اوّل کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ اس طویل سفر کی جانب مڑ کر دیکھیں تو نثر اُردو کے ارتقاء میں خطوطِ غالبؔ سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سر سید کے 'تہذیب الاخلاق' کے متعلق مہدی حسن نے کہا تھا کہ نئی نسل اپنی ساری علمی و ادبی ترقیوں کے باوجود 'تہذیب الاخلاق' کی پروردہ اور مرہونِ منت ہے۔ اسی طرح اُردو نثر کے بارے میں اگر کہا جائے کہ وہ اپنی تمام علمی و ادبی ترقی کے لیے خطوطِ غالبؔ کی مرہونِ منت ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ خطوطِ غالبؔ سے قبل کے نثری سرمائے پر نظر ڈالیں تو ایک طرف دکن میں سب رس کا اُسلوب ہے جس میں مقامیت اور علاقائی ثقافت کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ مقفیٰ اور مسجع پیرایۂ بیان ہے تو دوسری طرف شمالی ہند میں تحسین کی ''نو طرزِ مرصع'' کے زیرِ اثر اسی اُسلوب کی ملی جلی شکل موجود ہے۔ دور از کار تشبیہات اور ثقیل اُسلوب سے اپنی علمیت جتانے کا رجحان اس اُسلوب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس کے بعد اُردو نثر میں ایک کروٹ فورٹ ولیم کالج کی بدولت ضرور آئی ہے جس میں سادگی اور صفائی تو ہے لیکن یہاں پر شخصی انداز بالکل مفقود ہے۔ یہ مرزا غالبؔ ہیں جنھوں نے پہلی مرتبہ اُردو نثر کو شخصی اُسلوب سے نوازا۔ یہاں پر تاثراتی انداز بھی ہے اور ساتھ ساتھ ہی مکالماتی فضا نے اس میں ایک پُر اسرار ڈرامائیت بھی پیدا کر دی ہے۔ گویا ایک طرح سے ان خطوط میں جدید اصنافِ نثر کے ابتدائی نقوش اُبھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس لیے ڈاکٹر غلام حسین

ذوالفقار کی یہ رائے بڑی وقیع معلوم ہوتی ہے:

> ”اُردو نثر میں مختصر افسانے، انشائیے اور ڈرامے کی اصناف غالبؔ کے بعد جنم لیتی ہیں۔ لیکن ان اصناف اَدب کے لیے اسالیب بیان کے نمونے غالبؔ کے خطوط میں ملتے ہیں اور یہ نمونے اتنے حقیقی اور جان دار ہیں کہ افسانے، انشائیے اور ڈرامے سے زیادہ لطف وکیف کے حامل ہیں۔“[۱]

خطوط غالبؔ کے محاسن میں بے ساختگی، شگفتگی، طنز و مزاح اور ظرافت کے پہلوؤں پر تو کسی کو شبہ نہیں البتہ مرزا کی مکتوب نگاری کی ابتدا پر ہمیشہ ناقدین معترض رہے ہیں اسی لیے کسی آخری محاکمہ کی نوبت تاحال مشکوک ہے۔ غالبؔ کے پہلے باقاعدہ نقاد مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں مرزا کی اُردو مکتوب نگاری کے سن کا تعین کرتے ہوئے کہا تھا کہ مرزا کو ۱۸۵۰ء میں بہادر شاہ ظفر کی طرف سے تاریخ تیموریہ لکھنے کی خدمت سونپی گئی اور وہ ہمہ تن ”مہر نیم روز“ لکھنے میں مصروف تھے۔ جس کے باعث قدیم فارسی اُسلوب خطوط نویسی جس میں قوتِ متخیلہ کا عمل شاعری سے بھی زیادہ غالب معلوم ہوتا، ان سے نبھ نہیں سکتا تھا۔ اس لیے قیاس ہے کہ انھوں نے ۱۸۵۰ء سے فارسی کی بجائے اُردو میں خط لکھنے شروع کر دیے۔ مولانا حالیؔ کے اس موقف کو جدید تحقیق نے غلط ثابت کر دیا ہے اس لیے کہ اب ۱۸۴۸ء کے خطوط دستیاب ہو چکے ہیں۔ چوں کہ مولانا حالیؔ نے اپنے دعوے اور حقائق کو قیاس کی عینک سے دیکھا ہے۔ جس کے باعث ان کی یہ رائے زیادہ دیر تک وقیع نہیں سمجھی گئی۔

مولانا غلام رسول مہر نے اپنی تصنیف غالب میں مولانا حالیؔ کے بیانات کو دلائل سے غلط ثابت کر دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ”مہر نیم روز“ کوئی بڑی کتاب نہیں ہے کہ جس کے لیے اوقات کا بیشتر حصہ اس کی خاطر صرف کرنا پڑتا۔ یہ کتاب چار سال کی مدت میں مکمل ہوئی اور کل صفحات ۱۱۸ تھے جو سال میں اوسطاً پچیس صفحے بنتے ہیں۔ اس لیے غالبؔ کے بارے میں یہ کہنا کہ پچیس صفحات کی ترتیب وتکمیل کے لیے انھیں فارسی خطوط نویسی ترک کرنا پڑی بجائے خود ایک ستم ظریفی ہے۔ مولانا مہر نے ایک اور باریک

نکتہ اٹھایا ہے کہ غالب اپنے فارسی خطوط میں بھی الجھاؤ کے برعکس بے تکلفی سے کام لیتے تھے۔ مولانا مہر لکھتے ہیں:

''اُردو خطوط کی طرح فارسی خطوط میں بھی تکلفات سے آزادگی ہر مقام پر ظاہر ہے۔''[۳۰]

مولانا مہر نے خطوط کے زمانۂ آغاز پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس دور میں فارسی کا رواج ختم ہونے کے ساتھ ساتھ مرزا کی فارسی خطوط نویسی بھی کم ہوتی گئی اور اُردو کا رواج بڑھتا گیا۔ اس طرح مرزا نے بھی اُردو کو ذریعہ تخاطب بنالیا۔ مولانا عرشی نے مکاتیبِ غالب کے دیباچہ میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے بڑی حد تک مولانا حالی سے اتفاق کیا ہے اور اس امر سے بھی اتفاق کیا ہے کہ فارسی اُسلوب اطمینان خاطر و توانائی دماغ و قلب کا مستقاضی تھا البتہ ''مہر نیم روز'' کی تالیف نے جس مصروفیت کا تقاضا کیا اس میں اس فارسی اُسلوب کے لیے وقت نہ تھا۔ مجبوراً مرزا غالب کو اُردو کا سہارا لینا پڑا۔ اس کے ساتھ مولانا عرشی نے ایک دلیل یہ دی ہے کہ ۱۸۵۴ء میں ذوق کے انتقال سے غالب پر ایک اور بوجھ اُستادِ شاہ ہونے کا پڑا۔ جس کے باعث اس عدیم الفرصتی میں اور اضافہ ہوا۔ بایں ہمہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد مرزا کے حالات میں ناگفتہ بہ تبدیلی واقع ہوئی افکار کی زیادتی اور معاشی پریشانی کے باعث اطمینان خاطر قطعی ختم ہوگیا۔ ان ایام میں ویسے بھی اُردو ان کی انشا پر سرعت کے ساتھ چھانے لگی تھی۔ تا آں کہ ۱۸۶۱ء میں مرزا نے عزم کرلیا کہ آئندہ فارسی میں کچھ نہ لکھیں گے۔ اس سلسلہ میں مولانا لکھتے ہیں:

''آج ہمارے پاس سنہ مذکور (۱۸۶۱ء) کے بعد کی فارسی تحریریں معدوم ہیں۔''[۳۱]

مولانا عرشی کے موقف پر بھی مولانا مہر کے دلائل بڑی حد تک پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اس لیے مولانا مہر کی رائے زیادہ معتبر معلوم ہوتی ہے اور آخری عمر میں اُسلوب کو ترک کرنے کا بہانہ زیادہ جچتا نہیں ہے۔

مرزا کے ان نامور محققین میں ایک اہم نام مالک رام کا ہے۔ اس سلسلہ میں ان

کا تجزیہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مالک رام نے مرزا کی اُردو خطوط نویسی کے سن کا تعین کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مرزا ایک مدت تک اپنے خطوط فارسی زبان میں لکھتے رہے لیکن ۱۸۴۶ء کے وسط میں بل کہ عین ممکن ہے کہ اس سے بھی کچھ پہلے، انھوں نے عام طور پر فارسی میں خط لکھنا بہت کم کر دیا اور اس کے بعد خاص حالات کے سوائے آخر تک وہ اُردو ہی میں لکھا کرتے۔" [۴]

مالک رام اور بعض دوسرے ناقدین کے مطابق غالبؔ کی اُردو مکتوب نگاری کے وقت مرزا کی عمر تقریباً پچاس کے لگ بھگ تھی۔ اس حوالہ سے مرزا کی اُردو خطوط نویسی کے تعین کے لیے ۱۸۴۸ء اور اس کے بعد کا زمانہ موضوعِ بحث بنے گا۔ اس زمانے کی سائنسی ترقیاں جو اس عہد کے ہندستان میں عجوبۂ روزگار سے کم نہ تھیں۔ ایک طرف یہ سب اور دوسری طرف مرزا کا سفرِ کلکتہ جس میں انھوں نے ان ترقیوں کو اپنے ہم عصر افراد کی نسبت کہیں پہلے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا، ان کا اثر مرزا کی جدت پسند طبیعت پر لازماً پڑا ہوگا۔

اگر یہ کہا جائے کہ آخری عمر میں مرزا فارسی اُسلوب کو نبھانے کے قابل نہیں تھے تو یہ بات کچھ دل کو نہیں لگتی ہے۔ اس لیے کہ وہ شخص جو تمام عمر فارسی دانی کا دعوا کرتا رہا ہو اور جس نے اپنے فارسی اُسلوب کے باعث اپنے اُردو کلام کو بے رنگ کہہ دیا ہو۔ کیا عمر کے آخری حصے میں اس کے اُسلوب میں پختگی آئے گی؟ ناپختہ نہیں ہوگا۔ یا اس پچاس سالہ عمر میں اس اُسلوب کو نبھانے میں اسے دقتِ نظر کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے دلیل بے وزن معلوم ہوتی ہے۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اُردو خطوط نویسی کا آغاز مرزا کی جدت پسندی کی اختراع ہے۔ اسی لیے تو انھوں نے سرسیّد کی آئین اکبری کی تقریظ میں ان کی قدامت پسندی کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ اس لیے کہ مرزا اپنے شعور اور تخیل کی آنکھ سے آنے والے حالات کا ادراک رکھتے تھے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ مرزا کی اُردو خطوط نویسی بے ساختگی کا عطیہ ہے اور یہ کسی کاوش کے بغیر اتفاقاً ان سے سرزد ہو گئی تو پھر بھی قدر - کا عطیہ سمجھ کر شکر گزار ہونا چاہیے کہ

مرزا نے اُردو نثر کو ایک اعلا اُسلوب عطا کیا۔

اس طرح مہر نیم روز کی مصروفیت کا فارسی اُسلوب کے راستے میں حائل ہونا بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ مولانا مہر کی یہ رائے وقیع معلوم ہوتی ہے کہ مرزا کے فارسی خطوط کا اُسلوب بھی تکلفات سے بری معلوم ہوتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس اُسلوب کا بھی اُردو خطوط نویسی پر کچھ اثر پڑا ہو۔

مولانا حالؔی نے مرزا کی طبیعت میں روشِ عام سے ہٹ کر چلنے کی عادت کو ان کی فطرت ثانیہ قرار دیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اُردو مکتوب نگاری اس فطرت ثانیہ کا عطیہ ہو جس کے تحت مرزا قدیم اُسلوب خطوط نویسی کے برعکس اپنے لیے ایک منفرد اور الگ معیاری اُسلوب متعین کرنا چاہتے ہیں۔

طباعت خطوط:

مرزا کی اُردو خطوط نویسی کے اسباب وعلل کا جائزہ لینے کے بعد ان خطوط کی طباعت کے مراحل کا جاننا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مرزا کے اُردو خطوط کم وبیش بیس سالوں کا روزنامچہ ہیں اور ان کے ذریعے مرزا کی اس بیس سالہ زندگی کا پوری طرح مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی لیے مرزا نے ان خطوط کی طباعت کا ذکر سن کر ان کے چھپنے کی ممانعت کردی تھی اور اُردو خطوط کی طباعت کا سوال سب سے پہلے غالبؔ کے شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ اور شیونرائن آرام نے (غالباً باہمی مشورے سے) اُٹھایا اور مرزا سے اس کی اجازت مانگی جس پر مرزا نے سختی سے منع کردیا اور آپس کی باتوں کو سب کے سامنے لانے کو طفلانہ حرکت قرار دیا۔

عود ہندی :

مرزا کی اس دلیل پر یہ دونوں حضرات (تفتہ اور شیونرائن) خاموش تو ہو گئے البتہ ان کی یہ خواہش اس امر کی دلیل تھی کہ ان خطوط کی ندرت وجدت ان کو ایک نہ ایک دن

ضرور زیور طباعت سے آراستہ کرنے پر مجبور کردے گی۔ لہٰذا تفتہ اور شیونرائن کے مذکورہ واقعہ کے ٹھیک دو سال بعد ۱۸۶۱ء میں عبدالغفور سرور مارہروی نے منشی ممتاز علی خان رئیس میرٹھ کے باہمی مشورے سے مرزا کی اجازت کے بغیر عبدالغفور سرور مارہروی کے نام غالب کے علمی خطوط کو چھاپنے کا منصوبہ بنا لیا اور شاہ عالم اور صاحب عالم کے خطوط کو بھی ان میں شامل کر لیا۔ اس مجموعہ کو مرزا کا پہلا مجموعہ خطوط سمجھنا چاہیے۔ عبدالغفور سرور مارہروی نے اس کا نام مہر غالب رکھا اور اس کا دیباچہ بھی خود ہی لکھا۔ اس میں کل ۳۱ خطوط تھے۔ ابھی یہ کام مکمل نہیں ہوا تھا کہ منشی ممتاز علی خان کو چند اور خطوط شامل کرنے کی ترکیب سوجھی اور انھوں نے سرور والے مجموعے کی اشاعت ملتوی کر کے اور خطوط جمع کرنے کے لیے تلاش شروع کی اور خواجہ غلام غوث بے خبر کی وساطت سے مزید ۱۳۷ خطوط جمع کیے۔ اس کے علاوہ چند تقریظیں، نظمیں اور نثریں بھی حاصل کیں اور ان سب کے مجموعہ کا نام عودِ ہندی رکھا اور پہلی مرتبہ مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع ہوا۔ یہ نسخہ غالبؔ کی وفات سے تقریباً چار مہینے قبل چھپا تھا۔ اس کے کل ۱۸۸ صفحات تھے۔ اس کے شروع میں منشی ممتاز علی خان کا لکھا ہوا دیباچہ تھا اور آخر میں قلق میرٹھی کی تقریظ اور چار تاریخی قطعے تھے جس کی قیمت ایک روپیہ فی نسخہ تھی۔

اُردوئے معلیٰ :

حصہ اول: عودِ ہندی کی اشاعت کا کام میرٹھ میں جاری تھا کہ احباب کی طرف سے دہلی میں بھی اشاعت کے لیے تقاضے ہونے لگے۔ ہر چند عودِ ہندی کی ترتیب کا کام ۱۸۶۱ء میں شروع ہوا تھا لیکن سلسلہ اتنی سستی سے چلا کہ کسی حد تک غالبؔ مایوس ہو چکے تھے۔ اس لیے احباب کے اصرار پر انھوں نے اپنے مزید خطوط اکٹھے کیے اور انھیں اپنی نگرانی میں مطبع اکمل المطابع، دہلی میں شائع کرانے کا اہتمام کیا مگر افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور اس مجموعہ کی دید کی حسرت لیے ہوئے غالبؔ اس کی اشاعت سے ٹھیک انیس دن پہلے وفات پا گئے۔ یہ مجموعہ ۶ / مارچ ۱۹۶۹ء کو اُردوئے معلیٰ کے نام سے شائع

ہوا۔اس میں کل ۲۶۴ صفحے ہیں جن میں تین صفحے کا غلط نامہ بھی شامل ہے۔اس مطبع سے یہی مجموعہ دوبارہ ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا۔ اُردو معلی کے حصہ اول کے دیباچہ میں دوسرے حصہ کی اشاعت کا بھی وعدہ کیا گیا تھا لیکن اُردو معلی کا یہ حصہ دوم ابھی چھپا نہیں تھا کہ آخر کار اپریل ۱۸۹۹ء میں مرزا کے شاگرد رشید مولانا حالی کی نگرانی میں مطبع مجتبائی، دہلی میں دونوں حصے یک جا شائع کیے گئے۔ اُردو معلی کا ایک ایڈیشن یا مجموعہ شیخ مبارک علی تاجر کتب، لاہور نے بھی ۱۹۲۲ء میں کریمی پریس، لاہور سے شائع کیا اس میں پہلے دونوں حصوں کے ساتھ ساتھ ایک ضمیمہ کا اضافہ کیا اور دو خطوط کا بھی اضافہ کیا۔ یہ خطوط مرزا سجاد (مرحوم) کو لکھے گئے تھے۔

ضمیمہ اُردو معلی:

اردو معلی کا یہ ضمیمہ ۲۳ خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ شیخ مبارک علی کے نسخہ میں ایک قابلِ قدر اضافہ تصور کیا گیا ہے۔ یہ ضمیمہ شیر محمد سرخوش نے ترتیب دیا تھا ان میں قدر بلگرامی اور لطیف احمد بلگرامی کے نام جو خط اس ضمیمہ میں شامل ہیں اس سے قبل ۱۹۰۷ء میں اردو معلی، علی گڑھ کے دسمبر کے شمارے میں مولوی اصغر علی بلگرامی نے شائع کیے تھے لیکن سرخوش نے اس کی نشان دہی کیے بغیر انھیں اس ایڈیشن میں شامل کر دیا۔

خطوطِ غالب کی جمع و تدوین کا ایک سلسلہ اب چل نکلا تھا اور اسی سلسلہ کی ایک کڑی ۱۹۲۹ء میں محمد عسکری کا مرتبہ ایک نسخہ سامنے آیا۔ محمد عسکری نے ادبی خطوط غالب کے عنوان سے اس مجموعہ میں ایسے خطوط شامل کیے جن میں مرزا نے اپنے تلامذہ یا کسی شخص کو اصلاح دی یا کسی ادبی مسئلہ پر روشنی ڈالی۔

مولانا عرشی تک خطوطِ غالب کی جمع و تدوین کے اس پس منظر کے بعد اب مولانا کے مرتبہ مکاتیب غالب کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا اور ان مکاتیب کی افادیت سے بحث کی جائے گی۔ نیز بطور محقق و مدون ان مکاتیب کی تدوین کے حوالہ سے مولانا کی

خدمات کو جاننے کی کوشش کی جائے گی۔ مولانا کا ان مکاتیب کو ترتیب دینے کا انداز بھی زیرِ بحث لایا جائے گا۔

مکاتیبِ غالبؔ:

غالبؔ شناسی کی روایت میں جہاں ایک طرف غالبؔ کے دیوان کی مختلف اشاعتوں اور پھر کلامِ غالبؔ پر لکھی گئی یکے بعد دیگرے مختلف شرحوں کی بدولت استحکام پیدا ہوا وہاں دوسری طرف خطوطِ غالبؔ نے بھی غالبؔ شناسی میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کے ربع اول میں خطوطِ غالبؔ کی متعدد اشاعتوں سے غالبؔ کو صاحبِ اُسلوب ہونے کے ساتھ قبولِ عام کی سند مل چکی تھی اور اَدبی حلقوں میں خطوط کی مزید چھان بین کا ایک سلسلہ چل نکلا تھا۔ اس دوران غالبؔ کے خطوط کا ایک نادر اور حزین ایڈیشن مولانا عرشیؔ کے ذریعے منظرِ عام پر آتا ہے۔ یہ خطوط مرزا نے اپنے تعلقات رام پور کے زمانہ میں والیانِ رام پور اور بعض دوسرے اصحاب کے نام لکھے تھے۔ مولانا عرشیؔ کی محققانہ ژرف نگاہی نے انھیں گوشۂ گم نامی سے نکال کر اہلِ اَدب کے حضور پیش کیا اور اپنے حُسنِ ذوق اور ذوقِ لطیف کی سند حاصل کی۔ ان خطوط کے متعلق مالک رام لکھتے ہیں:

> ”یہ خطوط ستر بہتر برس سے کتاب خانہ رام پور میں پڑے تھے لیکن کسی نے ان کی طرف توجہ نہ کی اور میرا ذاتی خیال ہے کہ اچھا ہی ہوا کہ ان کی طرف کسی کا دھیان نہیں پڑا ورنہ کوئی اناڑی ڈاکٹر انھیں غلط سلط چھاپ دیتا۔ اور یوں یہ ہمیشہ کے لیے غارت ہو جاتے۔ عرشیؔ صاحب نے انھیں زندۂ جاوید کر دیا۔ پھر جس اہتمام سے یہ کتاب شائع ہوئی ہے وہ بجائے خود اُردو طباعت میں سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ اس حوالے سے اگر کوئی کتاب اس کا مقابلہ کر سکتی ہے تو وہ عرشیؔ صاحب ہی کا شائع کردہ انتخابِ غالبؔ ہے۔ اُردو میں اتنی حسین کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔“[۵]

'اشاریہ غالبؔ' میں ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب کے مطابق مرزا کا رام پور کے دربار سے رابطہ بارہ برس تک رہا۔ جنوری ۱۸۵۷ء سے لے کر مارچ ۱۸۶۵ء تک نواب یوسف علی خان کے ساتھ خط و کتابت رہی۔ یہی والئی ریاست مرزا کے شاگرد بھی تھے اور خاص طور سے مرزا کے مربی بھی! ان کی وفات کے بعد نواب کلب علی خان کے ساتھ مراسلت مرزا کی وفات تک برابر جاری رہی۔ مرزا کی آخری دس سالہ زندگی میں والیانِ رام پور کا جو مربیانہ سلوک رہا ہے وہ مرزا کے خطوط بالخصوص مکاتیبِ غالبؔ کی ہر سطر سے عیاں ہے۔ مولانا عرشی نے بھی دیباچہ میں اس تعلق پر اچھی خاصی روشنی ڈالی ہے۔ ان مکاتیب کے چھے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں مگر حد درجہ کوشش و جستجو کے باوجود تمام ایڈیشن میسر نہ ہو سکے۔ جس کے باعث ہر نسخہ کا فرق بیان کرنا ناممکن ہو گیا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر ایڈیشن میں مولانا عرشی نے دیباچہ اور خطوط کا اضافہ کیا ہے اور پہلے ایڈیشن میں باقی ماندہ خامیوں کو دُور کرنے کی کوشش کی۔ مکاتیبِ غالبؔ کی اشاعتوں کی ترتیب کچھ اس طرح ہے:

مکاتیبِ غالبؔ	طبع اول	۱۹۳۷ء
مکاتیبِ غالبؔ	طبع دوم	۱۹۴۳ء
مکاتیبِ غالبؔ	طبع سوم	۱۹۴۵ء
مکاتیبِ غالبؔ	طبع چہارم	۱۹۴۶ء
مکاتیبِ غالبؔ	طبع پنجم	۱۹۴۷ء
مکاتیبِ غالبؔ	طبع ششم	۱۹۴۹ء

طبع اول:

مطبع قیمہ، بمبئی سے پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

تقریب اور دیباچہ	۱۸۳صفحات
مکاتیب	۱۳۵صفحات
خطوط کی تعداد	۱۱۵

ترتیب کتاب:

تقریب، تمہید، سرگزشت غالبؔ، تصانیفؔ (غالبؔ)، تلامذہ، لوازمات امارت، انگریزی تعلقات، بہادر شاہ ظفر سے تعلقات، تعلقات رام پور۔ متعلقات غالبؔ، طباعت خطوط، عودِ ہندی اور اردو معلیٰ کے پہلے ایڈیشنوں پر تبصرہ۔

خطوط کی تفصیل:

۱۔	نواب یوسف علی خان کے نام اُردو بشمول چار فارسی خطوط	۴۱ خط
۲۔	نواب کلب علی خان کے نام	۶۴ خط
۳۔	صاحب زادہ سیّد زین العابدین خان کے نام	۲ خط
۴۔	منشی سیل چند کے نام	۶ خط
۵۔	خلیفہ احمد علی کے نام	۱ خط
۶۔	مولوی محمد حسن خان کے نام	۱ خط
	کل خطوط	۱۱۵ خط

اس ایڈیشن کو خواص و عوام میں مقبول بنانے والے عناصر میں اس کی ظاہری شکل وصورت اور اس کی ترتیب کو بڑا دخل ہے۔ اس ایڈیشن میں پہلی نظر میں جن اُمور پر قاری مسرت کا اظہار کرتا ہے ان میں اولاً اس کی نسخ ٹائپ میں خوب صورت سفید اور موٹے کاغذ پر طباعت ہے۔

دوم۔ مرزا کی ایک تصویر اس نسخہ کے شروع میں موجود ہے اور اس تصویر کے

ساتھ ہی ہلکے پلاسٹک کاغذ سے تصویر کی جاذبیت میں اضافہ کیا گیا ہے جو اپنے عہد میں بالکل نئی دریافت معلوم ہوتی ہے۔

تیسرا پہلو اس کی جاذبیت کا والیان رام پور کی تصاویر ہیں۔ ان میں بھی پلاسٹک کاغذ سے خوب صورتی پیدا کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ چوتھی منفرد چیز یہ ہے کہ مرزا کے خطی نسخہ کا ایک نمونہ بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔

ان چند ظاہری خوبیوں کے ساتھ ساتھ مواد کے اعتبار سے بھی ان خطوط کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں مولانا عرشی کے طویل دیباچہ نے فکری وفنی حُسن پیدا کیا ہے۔ جس میں مرزا کے خطوط کے محاسن پر پہلی بار سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ان فنی پہلوؤں کو اُجاگر کرنے میں مقدور بھر سعی سے کام لیا ہے۔ جن کے باعث اُردو نثر کی تاریخ میں یہ خطوط منفرد مقام رکھتے ہیں۔

خطوط کے شروع میں دیباچہ میں مولانا عرشی نے اپنی فطری انکساری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ وہ اتنا اعلا اور معیاری نسخہ پیش کرنے کے باوجود کسی طرح کے غرور اور فخر کا اظہار نہیں کرتے۔ فرماتے ہیں:

> "مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میرزا غالبؔ کے سہل ممتنع مکتوبات پر حواشی کا اضافہ ریشمی لباس میں ٹاٹ کا پیوند لگانا اور ان کی انشاء پر اظہار رائے آفتاب کو دنیا سے روشناس بنانا ہے۔ تاہم اس کی قبولیت کا خواست گار اور یہ سوچ کر کہ قبولیت کے لیے نازخوبی سے زیادہ نیاز خلوص کی ضرورت ہے جو میرا واحد سرمایۂ حیات ہے۔ اپنی مراد کے حصول کا اُمیدوار ہوں۔"[۲۰]

دیباچہ میں مولانا عرشی کے اعتراف کی ایک ایک سطر سے ان کے خلوصِ نیت اور اپنے کام سے لگن اور جذبہ صداقت کا اظہار ہوتا ہے۔ مولانا عرشی کی اسی لگن اور محبت نے ان کے کام کو مقبولیت کی سند عطا کی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں طبع اوّل کی چند اہم خصوصیات کو احاطۂ تحریر میں لایا جائے:

۱۔ مولانا عرشی نے مکاتیبِ غالب کی تعداد سے زیادہ مفصل دیباچہ تحریر کیا ہے۔ گویا مکاتیب سے زیادہ ان کے دیباچہ کے صفحات ہیں۔

۲۔ مقدمہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے محققین کے برعکس مولانا عرشی نے مرزا کے سوانحی حالات کو ان کے مکاتیب سے تلاش کر کے مرتب کرنے کی کوشش کی ہے اور حتی المقدور قیاس کے گھوڑے دوڑانے سے گریز کیا ہے۔ اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دیباچہ ہذا میں عنوان سرگزشت کے ماتحت صرف وہی حالات لکھے گئے ہیں جن کا ذکر اس مجموعہ کے مکاتیب میں ہوا ہے۔ دیگر تمام عام حالات نظر انداز کر دیئے گئے ہیں۔''[۲]

اسی طرح حالاتِ زندگی کے عنوان میں مرزا کے خاندان کا جائزہ ان کے خطوط کی روشنی میں لیا گیا ہے۔ پیدائش سے وفات تک کے تمام احباب کو ایک لڑی کی صورت میں پرو دیا ہے۔ عادات و اطوار پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی پر اثر انداز ہونے والے اہم واقعات کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر سے لے کر انگریزی تعلقات اور والیانِ رام پور سے روابط کے اسباب و علل اور اثرات کا محققانہ جائزہ لیا گیا ہے۔

۳۔ دیباچہ کا ایک عنوان ''انشائے غالب'' ہے، اس عنوان کے تحت مرزا کی اُردو خطوط نویسی پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مولانا حالؔی سے لے کر غلام رسول مہر تک کے بیانات کی روشنی میں ان واقعات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ مولانا عرشؔی کے خیال میں مرزا حالات کے شکنجوں میں بُری طرح جکڑے ہوئے تھے اور آخری دور میں معاشی بدحالی نے ان سے اطمینان خاطر بھی چھین لیا تھا۔ غدر کے

حالات بھی مرزا پر بری طرح اثر انداز ہوئے تھے اس لیے فارسی اُسلوب کی آرائش وزیبائش اب مرزا کے بس کا روگ نہیں رہا تھا۔ اس لیے اُردو مکتوب نگاری اور انشا پردازی ان کے اعصاب پر چھاتی چلی گئی۔ اس عنوان میں مولانا عرشی نے خطوطِ غالب کے جو محاسن پیش کیے ہیں وہ تفہیمِ غالب کے حوالہ سے معلومات کا خزانہ ہیں۔

دیباچہ میں خطوطِ غالب کی اولین طباعت واشاعت کا بھی بیان موجود ہے۔ عودِ ہندی اور اُردوئے معلیٰ کے تکمیلی مراحل کا تفصیلی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

دیباچہ میں خطوط کے محاسن اور مرزا کے سوانحی حالات کے ساتھ ساتھ مرزا غالب خطوط نویسی میں جن اُمور کا دھیان رکھا کرتے تھے ان کا بیان بھی بڑا دل چسپ ہے۔ مرزا کا فارغ اوقات میں لفافے بنانے کا مشغلہ۔ جس نمونے کی سیاہی اور قلم استعمال کرتے تھے، دوات اور کاغذات کے بارے میں مولانا عرشی نے جزئیات نگاری سے کام لیا ہے۔ مرزا کے خطوط میں ایڈریس لکھنے کے انداز کو بھی مولانا عرشی نے خط کے نمونے سے دکھایا ہے۔ نیز مرزا کا ایک قلمی خط بھی نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس دیباچہ کا ایک دل چسپ پہلو یہ ہے کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ مرزا کاغذ کے انتخاب میں مکتوب الیہ کے مرتبے کا بھی خاص خیال رکھتے تھے۔

مکاتیبِ غالب:

طبعِ اول میں مفصل دیباچہ کو جس طرح حُسنِ ترتیب سے نکھارا گیا ہے اس طرح خطوط کو ترتیب دیتے ہوئے بڑی سلیقہ مندی کا ثبوت پیش کیا ہے۔

۱۔ ہر مکتوب الیہ کے ساتھ مرزا کے تعلقات کو واضح کیا گیا ہے۔ چناں چہ اصل خطوط پڑھنے سے پہلے قاری کو مکتوب الیہ کے تعارف سے ان خطوط کے سمجھنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔

۲۔ مفہوم طلب مکاتیب پر حاشیہ لکھ کر آسانی سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

۳۔ ایک خاص اَمر جو اس سلسلے میں مولانا عرشی کے پیشِ نظر رہا ہے اور جس سے خطوط کے پیش کرنے میں ایک انفرادیت بھی آ گئی ہے وہ یہ ہے کہ مولانا نے حتی الامکان اس بات کا خیال رکھا ہے کہ خطوطِ غالبؔ کے ساتھ ساتھ مرزا کی طرف سے مکتوب الیہ کو جو جواب دیا گیا یا جس خط کے جواب میں مرزا نے خط لکھا اس خط کو بھی حاشیے میں پیش کر دیا ہے۔ جس سے دونوں خطوط کی معنویت میں نہایت اہم اضافہ ہوا ہے اور دونوں طرف سے ہونے والی گفت گو میں ایک طرح کا ربط اور تسلسل بھی قائم رہا ہے۔

۴۔ موضوعات کے حوالے سے ان خطوط کی اہمیت پہ محاکمہ قدرے مشکل ہے۔ اس لیے کہ ان خطوط کی اہمیت دو طرح سے ہے۔ بظاہر معنوی اعتبار سے یہ خطوط اہم نہیں ہیں یعنی ان میں مرزا نے علمی اور اَدبی مسائل پر گفت گو نہیں کی ہے۔ اس لیے ایک طرح سے غیر اَدبی سے خطوط کہا جا سکتا ہے تاہم دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ یہ خطوط جس طرح مرزا کے آخری دس سالوں کا نقشہ پیش کرتے ہیں شاید ان سے زیادہ حقیقی دستاویز کوئی اور نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ بعض خطوط میں مرزا نے اپنے آباؤ اجداد اور خاندان کے متعلق والیانِ رام پور کو جو کچھ تحریر کیا ہے اس سے مرزا کے سوانحی حالات سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان خطوط میں مرزا ہنستے بولتے موسموں سے متاثر ہوتے اور اپنی پسند و ناپسند کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس لیے یہ خطوط میرزا کی کی خود نوشت سوانح عمری کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔

مکاتیبِ غالبؔ طبع اوّل پر معاصر جرائد و اخبارات کے تبصرے:

مکاتیبِ غالبؔ کی اشاعت اول پر مشاہیر اَدب کے تنقیدی ردِ عمل سے بھی اس تصنیف کے ہمہ گیر اثرات اور اس کی مقبولیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ معاصر جرائد رسائل ا اخبارا - میں مولانا عرشی کی اس کاوش کے بارے میں تعریفی و توصیفی تبصرے

شائع کیے گئے ان میں سے بعض تحریروں کی نشان دہی بے جا نہیں۔ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے اخبارات و جرائد کے یہ تاثرات رضا لائبریری، رام پور میں ایک بہت ہی قیمتی فائل میں محفوظ تھے۔ محترمی عرشی زادہ کی وساطت سے انھیں حاصل کیا گیا جن کے چند اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔ اس فائل کی خوبی یہ بھی ہے کہ ہر تبصرہ کے بعد مولانا عرشیؔ کی تصدیق آخر میں موجود ہے۔ ان تبصروں کی ''شانِ نزول'' کے متعلق جناب عرشی زادہ کی وضاحت اس طرح ہے کہ انھیں ۱۹۶۷ء میں بمبئی جانے کا اتفاق ہوا تو مطبع قیمہ کے مالک سے دورانِ ملاقات انھوں نے اپنے ابا حضور (مولانا عرشیؔ) کے کچھ مکاتیب کا ذکر چھیڑا تو انھوں نے عرشی زادہ کو ایک فائل عطا کی۔ یہ فائل مولانا عرشیؔ کے مرتبہ ایڈیشن مکاتیبِ غالب کے سلسلے میں تبصروں پر مشتمل تھی۔ عرشی زادہ نے مطبع قیمہ سے حاصل ہونے والی اس اہم فائل کو ۱۹۶۷ء میں رضا لائبریری کے سپرد کر دیا تا کہ یہ قیمتی علمی و ادبی سرمایہ محفوظ ہو سکے۔ اس ضمن میں عرشی زادہ رقم طراز ہیں:

> ''آج یہ فائل رضا لائبریری کی نذر کر رہا ہوں تا کہ یہ محفوظ رہے۔ مالک مطبع قیمہ نے مولانا آزاد کی مکاتیب غالبؔ پر رائے کی اصل بھی مجھے دی تھی اور بتایا تھا کہ مولانا بمبئی تشریف لائے ہوئے تھے اور ہم نے مکاتیب غالب کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں پیش کر کے رائے کی درخواست کی جو انھوں نے قلم برداشتہ لکھ دی۔ یہ اصل میں پہلے ہی لائبریری میں جمع کر چکا ہوں۔ اس کی ایک نقل زیرِ نظر فائل میں بھی ملی۔''۸

تبصرہ مولانا ابوالکلام آزاد:

مولانا آزاد کو بمبئی جانے کا اتفاق ہوا تو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مطبع قیمہ کے مالک نے انھیں مکاتیب کا ایک نسخہ پیش کیا اور ساتھ ہی ان پر رائے بھی دینے کی سفارش کر دی۔ چناں چہ مولانا ابوالکلام آزاد جیسی یکتائے روزگار شخصیت نے مولانا عرشیؔ

کی اس سعی وکاوش کے بارے میں فرمایا:

"مکاتیب غالب کی اشاعت پر ریاست رام پور مستحق تبریک ہے۔ اگر غالب کے رقعات کا یہ مجموعہ شائع نہ ہوتا تو ان کی آخری زندگی کے متعدد اہم گوشے تاریخ کی روشنی سے محروم رہ جاتے۔
عرشی صاحب نے ترتیب کے ساتھ بحث ونظر کا فریضہ بھی مولفانہ قابلیت کے ساتھ انجام دیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ مجھے اس بات سے خوشی ہوئی کہ طباعت کے لیے نسخ ٹائپ اختیار کیا گیا جس سے بہتر ٹائپ اُردو طباعت کے لیے نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلہ میں مطبع قیمہ بمبئی کی کارگزاری کا بھی اعتراف کرنا چاہیے۔"[۹۰]

روزنامہ انقلاب، لاہور:

لاہور سے شائع ہونے والے روزنامہ "انقلاب" کی اشاعت بابت یکم فروری سنہ ۱۹۳۸ء میں اس کے ایڈیٹر اور ماہر غالبیات مولانا غلام رسول مہر، مکاتیب غالب کے پہلے ایڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ مجموعہ اس وجہ سے بھی حد درجہ قابلِ قدر ہے کہ میرزا غالب کے ۱۱۶ غیر مطبوعہ خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس وجہ سے بھی حد درجہ قابلِ قدر ہے کہ اس سے غالب کے بعض حالات پر نہایت عمدہ روشنی پڑتی ہے اور اس وجہ سے بھی حد درجہ قابلِ قدر ہے کہ انتہائی اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے اور اس میں حُسنِ طباعت اور تشریحات وحواشی کا ایک ایسا اعلا نمونہ پیش کیا گیا ہے جس کی نظیر اُردو کی کتابوں میں شاید کسی دوسری جگہ ملے۔ مجموعۂ مکاتیب کے آغاز میں ۱۶۳ صفحے کا فاضلانہ دیباچہ ہے جو امتیاز علی صاحب عرشی ناظم کتب خانہ ریاست رام پور کے ذوقِ علم وادب کا ایک بیش بہا نمونہ ہے۔ تشریحات وحواشی میں عرشی صاحب نے، جو اس نادر مجموعہ کے مرتب ہیں فرماں روایان رام پور کے بعض فرامین وجوابی مکاتیب کے ضروری

اقتباسات بھی دیے ہیں تاکہ غالب کے مکاتیب کا کوئی پہلو تشنۂ اخذ و
منہم نہ رہے۔"۱۰۰

مولانا غلام رسول مہر نے اپنے مذکورہ تبصرے میں غالب کے والیانِ رام پور کے ساتھ تعلق کی بھی وضاحت فرمائی ہے نیز یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ان مکاتیب میں مولانا عرشی سے چند فروگزاشتیں بھی ہوئیں جن میں ایک یہ کہ مولانا عرشی نے کتاب کی ترتیب کے وقت مرزا کے ۱۸۶۷ء میں شائع شدہ مجموعہ سبد چیں کو پیشِ نظر نہیں رکھا۔ اس لیے تو ان مکاتیب میں شائع شدہ نظموں کو مولانا غیر مطبوعہ قرار دیتے ہیں حالاں کہ یہ سبد چیں میں چھپ چکی ہیں۔ بہر حال مولانا غلام رسول مہر اس ایڈیشن کی اشاعت پر اس معمولی فروگزاشت کے باوجود عرشی صاحب کے دلی شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اُردو میں ایسی نادر کتاب کا اضافہ کیا۔

تبصرہ ماہ وار مجلّہ "کتب نما":

جامعہ ملیہ، دہلی کے ماہ وار مجلّہ "کتب نما" کی (جلد ۲ نمبر ۱، ۲) ۳۸ء میں چھپنے والے رام پور ریویو میں ادارۂ مکاتیبِ غالب کی طبع اول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس کتاب سے غالب کی زندگی کے متعلق کئی باتیں ہمارے علم میں آئی ہیں ان کا بہت سا فارسی اُردو کلام پہلی بار منظرِ عام پر آیا ہے۔ فاضل مرتب نے شروع میں ۱۸۳ صفحے کے طویل اور مبسوط دیباچہ میں غالب کی سوانح عمری ان خطوط سے استنباط کر کے دے دی ہے۔ خطوط کے نیچے نہایت مفید حواشی تحریر کیے ہیں اور سب سے زیادہ قیمتی یہ کام کیا ہے کہ غالب کے خطوط کے جو جواب ریاست کی طرف سے انھیں لکھے گئے تھے ان کے ضروری اقتباسات دے دیے ہیں۔ خطوط میں جن اشخاص کا ذکر آیا ہے حتی الوسع ان کی مختصر سوانح عمریاں بھی حاشیہ میں بڑھا دی گئی ہیں۔ ہم قدردانانِ غالب کی طرف سے فاضل مرتب کا اور ان اصحاب کا شکریہ ادا کرتے ہیں جن کی مہربانی سے یہ مجموعہ شائع ہوا ہے۔"۱۰۱

تبصرہ رسالہ "ساقی":

ہندستان گیر شہرت کے مالک رسالہ "ساقی" دہلی بابت ماہ مارچ ۱۹۳۸ء میں مکاتیب غالب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ:

"جناب امتیاز علی عرشی نے جو اسٹیٹ لائبریری کے لائبریرین ہیں۔ایک بسیط مقدمہ اور حواشی کے ساتھ ان خطوط کو پیش کیا ہے...... کتاب مجلد ہے اور مطبع قیمہ، بمبئی کے نہایت خوش نما آہنی ٹائپ میں چھاپی گئی ہے......
جناب عرشی نے دو سال کی مسلسل کاوش تحقیق کے بعد اس کا جو مقدمہ لکھا ہے وہ ایک خاصہ کی چیز ہے اور ہمارے خیال میں ان سے بہتر اس خدمت کو کوئی اور انجام بھی نہیں دے سکتا تھا...... دیباچہ کو دیکھتے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عرشی نے کم و بیش بیس (۲۰) نہایت مستند اور نایاب کتب کی امداد سے مندرجہ بالا عنوانات (دیباچہ میں شامل عنوانات کا ذکر ہے) یہ خامہ فرسائی کی ہے اور ان سب سے زیادہ انھوں نے ان مکاتیب سے استفادہ کیا ہے جواب تک چشمہ حیوان کی طرح تاریکی میں رہے۔"[۱۲]

"مرزا غالب کی خطوط نویسی کے متعلق اگر بہترین معلومات حاصل کرنی ہوتو ہمارے خیال میں مولانا عرشی کے مرتب مکاتیب غالب کے دیباچے سے بہتر اور کہیں یک جا نہیں مل سکتی۔"[۱۳]

تبصرہ رسالہ "نگار" لکھنؤ:

مکاتیب غالب طبع اول پر تبصرہ کرتے ہوئے رسالہ نگار لکھنؤ بابت مارچ سن ۱۹۳۸ء میں ان خیالات کا اظہار کیا گیا ہے:۔

"یہ کتاب علاوہ ادبی خصوصیت کے ایک تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے......
آغاز میں ایک مفصل دیباچہ ہے، جس میں تعلقات رام پور اور میرزا صاحب کی انشا و متعلقات انشا پر خود میرزا صاحب کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔حواشی میں کوشش کی گئی ہے کہ میرزا صاحب کے خطوط کا کوئی گوشہ

تختۂ فہم نہ رہے اور جا بجا نواب فردوس مکان اور نواب خلد آشیاں کے خطوط کے اقتباسات بھی دیے گئے ہیں جس کی وجہ سے کتاب کی خوبی و قدر و قیمت دو بالا ہوگئی ہے۔ طباعت نہایت اعلا سفید ولایتی کاغذ پر روشن ٹائپ میں کرائی گئی ہے اور جلد نہایت خوش نما ہے۔ آخر میں متن انڈکس بھی دیے گئے ہیں۔ الغرض یہ کتاب ہر حیثیت سے مولانا عرشی کی فاضلانہ سعی و کاوش اور دربار رام پور کی شاہانہ علم دوستی کا بہترین نمونہ ہے۔"[۱۴]

تبصرہ رسالہ "اُردو" اورنگ آباد:

تبصروں کی مذکورہ فائل میں طویل تبصروں میں رسالہ "اُردو" اورنگ آباد کا تبصرہ بھی ہے لیکن افسوس ہے کہ اس رسالے کے سنہ اشاعت اور جلد کی تفصیل بیان نہیں کی گئی البتہ تبصرہ کے آخر میں مولانا عرشی کے تصدیقی دستخط ہیں جن کے مطابق نقل درست ہے۔ اس تبصرہ میں مکاتیب غالب پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ مرزا کے والیان رام پور سے تعلقات پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ان کی مراسلت کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ خطوط کے حوالوں سے خطوط کی خصوصیات کی نشان دہی بھی اس تبصرے کی خصوصیت ہے۔ مکتوب نمبر ۶۰ میں مرزا نے نواب کلب علی خاں کی مسند نشینی پر ایک غزل بھیجی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "مکتوب نمبر ۶۰ میں نواب کلب علی خان کے جشن مسند نشینی کی نذر میں ایک غزل نئی طرز کی نئی بحر میں عرض کی ہے۔ یہ غزل کلیات غالب میں موجود نہیں، غالباً پہلی دفعہ منظر عام پر آئی ہے اور ندرت و نفاست کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ پوری نقل کی جائے۔"[۱۵]

چناں چہ مبصر نے پوری غزل بھی نقل کر دی ہے۔ غرض ان مکاتب کی خصوصیات کو سمجھتے ہوئے بیان کیا گیا ہے:

> "بہرحال مکاتیب غالب مرزا صاحب کی گم شدہ یادگاروں کا

مجموعہ ہے۔ جسے ارباب شوق آنکھوں پر رکھیں گے اور فاضل مدون اور حکام ریاست کو دعا دیں گے کہ ان کی سعی و ہمت سے چھپا خزانہ نظر کے سامنے آ گیا۔"[۱۶۰]

تبصرہ "نیرنگ خیال" لاہور:

• اس رسالہ کی اشاعت کا سن بھی درج نہیں ہے۔ لیکن تبصروں کی فائل میں حاشیے میں عرشی زادہ کا بیان ہے کہ اس کی پوری نقل مولانا عرشی کے اپنے ہاتھ کی تحریر کردہ موجود ہے۔ مکاتیب پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

"غالب کے مکاتیب کا بغور مطالعہ کرنے سے غالب کے سوانح حیات کے بعض پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔ مکاتیب کے نیچے حواشی اور ان پر دیباچہ بڑی قابلیت سے لکھا گیا ہے۔ کتاب اُردو ٹائپ میں ہے جو بہت ہی خوش نما اور آسانی سے پڑھا جاتا ہے۔ اعلا درجہ کے کاغذ پر نہایت خوب صورت جلد کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ ہم اس قسم کی نادر تصنیف کی اشاعت پر والی ریاست رام پور اور ان کے کارکنوں کو دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔"[۱۷]

رسالہ "ہمایوں" لاہور:

رسالہ "ہمایوں" لاہور اپنی اشاعت ماہ مئی ۱۹۳۸ء میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ملک کے اَدبی حلقوں کو مولوی امتیاز علی صاحب عرشی ناظم کتب خانہ رام پور کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے رام پور کے شاہی کتب خانہ میں سے غالب کے وہ خط طبع کر کے شائع کر دیے جو نواب یوسف علی خان اور نواب کلب علی خان کے نام لکھے گئے تھے ...... مکاتیب کی زبان فصیح و سلیس اُردو معلی ہے جو غالب کا طرۂ امتیاز ہے۔ کتاب نہایت نفیس کاغذ

پر خوب صورت نسخ ٹائپ میں چھپی ہے۔[۱۸۰]

تبصرہ اخبار "حمایتِ اسلام" لاہور:

لاہور سے چھپنے والے اخبار "حمایت اسلام" کی اشاعت بابت ۱۲ مئی ۱۹۳۸ء میں مکاتیبِ غالب طبع اول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مکاتیبِ غالب القیمہ پریس کا غیر فانی شاہ کار ہے۔ غالبؔ جیسے بلند پایہ شاعر سے متعلق آج تک کوئی کتاب اتنی خوب صورت اور عمدہ نہیں چھپی، جتنی کہ یہ کتاب چھپی ہے۔ پوری کتاب صفحۂ اول سے لے کر صفحہ آخر تک دیکھی جائے، کہیں آپ کو طباعت کا کوئی نقص نظر نہیں آئے گا۔ پورے صفحات پر سیاہی کا کوئی دھبہ موجود نہیں ہے۔ سطریں، اعراب، سوالیہ نشانات ہر چیز حد سے زیادہ قابلِ تعریف ہے، کاغذ خوب صورت اور مضبوط ہے۔[۱۹۰]

رسالہ "معارف" کا تبصرہ:

رسالہ "معارف" اعظم گڑھ بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۳۸ء میں مکاتیب پر سیر حاصل بحث موجود ہے۔ رام پور ریاست سے تعلقات سے لے کر میرزا کی مکتوب نگاری تک کا بھرپور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ایڈیشن کے دیباچہ کی خصوصیات کا بھی تفصیلی تذکرہ اس تبصرہ کی خوبی تصور کرنا چاہیے۔ خطوط کی طباعت کے بارے میں رقم طراز ہے:

"جناب امتیاز علی صاحب عرشیؔ شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یہ اہم ادبی خدمت انجام دی اور ان خطوط کو ایک بسیط مقدمہ اور نفیس و ستھری طباعت کے ساتھ نہایت اہتمام سے شائع کیا...... مکاتیبِ غالب کا یہ مجموعہ اُردو ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ اور اس کے رتبہ کے مطابق اس کی ظاہری نفاست بھی لائق تعریف ہے، کتاب کی زینت کے لیے نواب یوسف علی خان، نواب کلب علی خان اور میرزا غالبؔ کے قلمی

مرقع کے فوٹو بھی دے دیے گئے ہیں اور میرزا کے ایک دستی خط کا عکس بھی شامل ہے۔"۲۰۰

تبصرہ اورینٹل کالج میگزین:

تبصروں کی اس مذکورہ فائل میں طویل ترین تبصرہ اورینٹل کالج میگزین کا ہے۔ یہ مولانا غلام رسول مہر ہی کا تحریر کردہ ہے۔ چھ صفحات پر محیط اس مفصل تبصرے میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں غالبؔ کی اہمیت اور مقام متعین کرنے کے علاوہ غالبؔ شناسی میں جو روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اس کو مولانا عرشیؔ کے دور میں، جس وقت کے مکاتیبِ غالب طبع اول کی اشاعت ہوئی تھی، ایک خوش آئند قدم تصور کیا ہے۔ مکاتیب میں خطوط کی تعداد کتاب کی کیفیت وکمیت کا بھی بغور تجزیہ پیش کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مکاتیب کے فاضلانہ دیباچہ پر مولانا عرشیؔ کی تعریف اور اس دیباچہ سے خطوطِ غالبؔ کی خصوصیات کی بھی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں:

> "کتاب خانہ رام پور کے فاضل ناظم جناب امتیاز علی صاحب عرشیؔ نے اسے انتہائی کاوش واہتمام کے ساتھ ترتیب دیا ہے اور اس پر ایک مبسوط و مفصل دیباچہ رقم فرمایا ہے۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ طباعت دیدہ زیبی کے اعتبار سے اوّل درجہ کی اُردو کتابوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔"۲۱۰۰

مکاتیبِ غالب طبع دوم ۱۹۴۳ء:

مکاتیبِ غالب کا دوسرا ایڈیشن "درسی ایڈیشن" تھا۔ یہ لیتھو طباعت کی صورت میں تھا۔ دیباچہ اور مکاتیب دونوں میں اضافہ کیا گیا اور بعض نئی معلومات بھی منظرِ عام پر لائی گئی ہیں۔ دیباچہ میں دو نئے عنوانات شامل کیے گئے ہیں۔

"دیباچہ پر نظر ثانی کرتے وقت پچھلے مباحث میں مناسب تغیر وتبدل کے

علاوہ "اصلاحِ غالبؔ" اور "املائی غالبؔ" کے نام سے دو نئے عنوانوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔"۲۲

مکاتیب کے دیباچہ میں مولانا عرشی نے طبع ثانی میں ردوبدل کے سلسلے میں جن پہلوؤں کا خیال رکھا ہے ان کا خلاصہ یوں ہے کہ:

۱۔ دوسری اشاعت کو پہلی اشاعت سے مواد کے اعتبار سے بہتر طور پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲۔ اصل خطوط کے ساتھ دوبارہ موازنہ کر کے متن کو مرزا کی تحریر کے مطابق بنایا گیا ہے۔

۳۔ غیر ضروری حواشی اور عبارتوں کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔

۴۔ نواب ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، صفیر بلگرامی اور فصیح الدین رنج میرٹھی کے غیر مطبوعہ قصائد اور اشعار کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔

۵۔ ان سب اضافوں کے ساتھ ساتھ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں مرزا کے ۱۴ نئے خطوط بھی شامل کیے ہیں۔

ضخامت:

دیباچہ ثانی............کل صفحات ۲۲۹

دیباچہ کا ہر صفحہ تقریباً بیس سے بائیس سطور پر مشتمل ہے اور ہر سطر میں بارہ سے پندرہ الفاظ ہیں۔ اس سے دیباچہ کی تفصیل اور جامعیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

دیباچہ میں "اصلاحِ غالبؔ" کے عنوان کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ باب اہم ہے۔ اس میں مرزا کے طویل خط کے حوالے سے ان کے طریق اصلاح کی نشان دہی کی گئی ہے۔ بیتاب کے نام ایک خط میں مرزا اپنی اصلاح کے طریقہ کو یوں بیان کرتے ہیں:

"قبلہ جس شعر پر صاد ہے وہ بہت خوب ہے اور جس کو کاٹ دیا ہے وہ

معیوب ہے اور جس پر صاد نہیں وہ بے عیب اور ہموار اور جس کے معنی میں مجھے تامل اوسپر نظر، علامت اس کی قضا۔ باقی جا بجا منشاء اصلاح اور حقیقت الفاظ لکھ دی ہے۔"[۴۳]

......دیباچہ میں نئے باب میں "املائی غالبؔ" کا ایک باب ہے۔ اس میں مرزا کے قواعد کے اُصولوں سے بحث کی گئی ہے۔ مرزا لفظوں کو قواعد کی رُو سے کس طرح کہتے تھے ان کو پیش کر کے عرشیؔ نے اس اضافہ کو ایک علمی شکل دے دی ہے۔

تحقیقی ژرف نگاہی کا ثبوت مولانا عرشیؔ نے دیباچہ میں ایک اور طرح سے بھی دیا ہے وہ یہ کہ مرزا کے لفافوں کے پتوں پر محاکمہ پیش کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ صرف دو خطوط پر اُردو میں پتہ تحریر ہے باقی سب پر فارسی میں پتہ درج کیا ہے۔ اُردو والوں میں ایک خط مولوی محمد حسن خان مالک مطبع حسن رام پور کے نام اور دوسرا جنون دہلوی کے نام لکھا گیا ہے۔[۴۴]

مکاتیب = کل صفحات = ۱۱۶

نواب یوسف علی خان فردوس مکان کے حقیقی چچازاد بھائی صاحب زادہ محمد عباس علی خان صاحب بہادر جو بیتابؔ تخلص کرتے تھے ان کے نام ایک خط بڑا اہم ہے۔ اس میں مرزا سے ان کے "بیتابؔ" کے طویل قصائد میں اصلاح دی ہے اور اپنا طریقہ اصلاح بیان کیا ہے۔ طبع ثانی کی انفرادیت اس پہلو سے بھی ہے کہ طبع اول کے برعکس یہاں تمام حواشی کو آخر میں پیش کر دیا گیا ہے۔

طبع چہارم:

تیسرا ایڈیشن دستیاب نہ ہو سکنے کے باعث طبع چہارم کا مختصر حال ہی بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ چوتھا ایڈیشن ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ یہ بھی درسی ایڈیشن ہی تھا اور سستے اخباری کاغذ پر فوری ضرورت کے تحت چھاپا گیا تھا۔

دیباچہ میں اس اشاعت کے بارے میں مولانا عرشیؔ کا بیان ہے کہ وہ اس ایڈیشن

کو پہلے سے بہتر طریقہ پر شائع کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ایک طرف دوسری جنگِ عظیم کے باعث کاغذ کی گرانی نے اور دوسری طرف یونی ورسٹیوں میں شاملِ نصاب ہونے کے باعث طلبہ کی ضرورت نے ان کی اس خواہش کی تکمیل نہ ہونے دی۔ اس ایڈیشن کے مواد کے لیے پھر بھی مولانا عرشی نے ایک جدت پیدا کی ہے اور اس ایڈیشن کو مرزا کے پسندیدہ طرزِ املا پر ترتیب دیا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا عرشی کی وضاحت ملاحظہ فرمایئے:

> ''اب کہ یہ چوتھا ایڈیشن نسخہ شائع کیا جارہا ہے۔ مرتب کو اطمینان ہے کہ اس کا متن میرزا صاحب کے پسندیدہ اُصول املا کے بالکل مطابق اور دیباچے اور حواشی کے مباحث پچھلی تمام طباعتوں سے زیادہ صحیح اور مفید ہیں۔''۲۵۰

طبع چہارم میں مکاتیب کی تعداد ۱۳۰ ہوگئی ہے۔ اس میں پہلے ایڈیشنوں کے برعکس مجموعی تعداد کے علاوہ ہر مکتوب الیہ کے نام مکاتیب کی الگ تعداد بھی درج کردی گئی ہے۔

تفصیل مکاتیب:

مکتوب الیہ	تعداد خطوط	صفحہ
نواب یوسف علی خان فردوس مکان	۴۴	۱ تا ۴۳
نواب کلب علی خان خلد آشیاں	۷۳	۴۴ تا ۸۴
نواب زین العابدین خان عرف کلن میاں	۲	۸۵ تا ۸۷
نواب صاحب زادہ محمد عباس علی خان بیتاب	۲۷	۸۸ تا ۱۰۸
بنام منشی سیا چند میر منشی	۷	۱۰۹ تا ۱۱۳
بنام خلیفہ احمد علی رام پوری	۱	۱۱۴ تا ۱۱۷
بنام مولوی محمد حسین خان	۱	۱۱۷ تا ۱۱۸
کل مکاتیب :	۱۳۰	

طبع چہارم کے بعد پنجم اور ششم کے ایڈیشن دستیاب نہیں ہو سکے۔ البتہ عرشی زادہ نے طبع ششم کی تفصیلات ایک مکتوب میں ارسال کی ہیں اس لیے صرف ان ہی تفصیلات پر اکتفا کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں عرشی زادہ رقم طراز ہیں:

"چھٹے ایڈیشن میں مکاتیبِ غالب کی تعداد سے متعلق آبا مرحوم نے جو کچھ لکھا ہے وہ نقل کر کے بھیجتا ہوں۔"۲۶

تفصیل مکاتیب غالب طبع ششم:

صفحات دیباچہ	:	۲۰۴
صفحات خطوط و حواشی	:	۲۰۵
کل صفحات	:	۴۰۹

....

مجموعہ ہذا کے مکاتیب کی تعداد ۱۲۹ ہے۔

بنام نواب یوسف علی خان فردوس مکان	:	۴۳
بنام نواب کلب علی خان خلد آشیان	:	۷۳
بنام صاحب زادہ سید زین العابدین خان بہادر	:	۲
بنام صاحب زادہ سید عباس علی خان بہادر جناب	:	۲
بنام منشی سیا چند میر منشی	:	۷
بنام خلیفہ احمد علی احمد پوری	:	۱
بنام مولوی محمد حسین خان	:	۱
		۱۲۹

نواب فردوس مکان یوسف علی خان کے نام یہ خط فارسی میں اور بقیہ ۳۹ اُردو میں ہیں اور چوں کہ مجموعہ میں ایک فارسی قصیدہ مستقل نمبر کے تحت درج ہوا ہے اس لیے ان کے نام خطوں کی تعداد ۴۴ اور کل مکتوبات کی تعداد ۱۳۰ ہو گئی ہے۔ مکاتیبِ غالب کے طبع

ششم کی فہرست کے برعکس عرشی زادہ کا ایک بیان ان مکاتیب کے سلسلہ میں بڑا اہم ہے جو مولانا عرشی کو دست برد زمانہ کے باعث دستیاب نہ ہو سکے۔ عرشی زادہ کے خیال میں نواب فردوس مکان اور نواب خلد آشیان کے فرامین کے مسودوں اور مرزا کے ان مکاتیب میں غالباً ۱۳۵ ایسے خطوط کے حوالے ملتے ہیں جو سرکاری مسلوں میں موجود نہیں ہیں۔ اگر یہ خطوط گم نہ ہوتے تو مکاتیبِ غالب کی تعداد ۳۶۴ تک پہنچ جاتی۔

....

حواشی

۱۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، محاسن خطوط غالب، ص ۲۱، مطبوعہ ۱۹۶۰ء، لاہور۔

۲۔ مولانا غلام رسول مہر، غالب، ص ۳۹۶، طبع چہارم، عالم گیر الیکٹرک پریس، لاہور، ۱۹۳۶ء۔

۳۔ عرشی، مکاتیب غالب، ص ۱۲۳، طبع اول ۱۹۳۷ء۔

۴۔ مالک رام، ذکرِ غالب، طبع پنجم، فروری ۱۹۷۶ء، مطبع جمال پرنٹنگ پریس، دہلی۔

۵۔ مالک رام، نذرِ عرشی، ص ۳۱، دہلی، ۱۹۶۵ء۔

۶۔ دیباچہ طبع اول، مکاتیبِ غالب، مرتبہ: مولانا عرشی، ص ۱، ۱۳۔

۷۔ دیباچہ مکاتیبِ غالب، مولانا عرشی، ص طبع اول۔

۸۔ عرشی زادہ، بحوالہ فائل، مکاتیبِ غالب، طبع اول ۱۹۳۷ء، مرتبہ: مولانا عرشی پر معاصر اخبار ورسائل کے تبصرے، ص ۲۔

۹۔ مولانا ابوالکلام آزاد، بحوالہ فائل "معاصر اخبارات و رسائل کے تبصرے، ص ۳، مرقومہ ۲۱، مئی ۱۹۳۸ء۔

۱۰۔ مولانا غلام رسول مہر: روزنامہ "انقلاب" بابت اشاعت یکم فروری ۱۹۳۸ء، بحوالہ فائل۔ مکاتیبِ غالب، طبع اول مرتبہ: مولانا عرشی پر معاصر اخبارات ورسائل کے تبصرے، ص ۵۔

۱۱۔ رسالہ "کتب نما" (ج ۲ نمبر ۱، ۲) ۱۹۳۸ء، بحوالہ فائل "مکاتیبِ غالب، طبع

اول پر معاصر اخبارات ورسائل کے تبصرے، ص ۸۔

۱۲۔ رسالہ "ساقی" دہلی، بابت مارچ ۱۹۳۸ء، بحوالہ فائل مکاتیب غالب طبع اول پر معاصر اخبارات ورسائل کے تبصرے، ص ۱۰۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۴۔

۱۴۔ رسالہ "نگار" لکھنؤ، بابت مارچ ۱۹۳۸ء۔

۱۵۔ رسالہ "اُردو" اورنگ آباد، بحوالہ فائل مکاتیب غالب طبع اول، پر معاصر اخبارات ورسائل کے تبصرے، ص ۱۸،۱۸۔

۱۶۔ رسالہ "اُردو" اورنگ آباد، بحوالہ فائل مکاتیب غالب طبع اول پر معاصر اخبارات و رسائل کے تبصرے، ص ۱۷۔۱۸۔

۱۷۔ رسالہ "نیرنگِ خیال" لاہور، بحوالہ فائل معاصر اخبارات ورسائل کے تبصرے، ص ۲۲۔

۱۸۔ رسالہ "ہمایوں" لاہور، مئی ۱۹۳۸ء، بحوالہ فائل معاصر اخبارات ورسائل کے تبصرے، ص ۲۳۔

۱۹۔ اخبار، حمایت اسلام، لاہور، بابت ۱۲۔ مئی ۱۹۳۸ء، ایضاً، ص ۲۵۔

۲۰۔ رسالہ "معارف" اعظم گڑھ، بابت مئی ۱۹۳۸ء، بحوالہ فائل مکاتیب غالب طبع اول پر معاصر اخبارات ورسائل کے تبصرے، ص ۲۷،۲۸۔

۲۱۔ اورینٹل کالج میگزین، ۲۶ جون ۱۹۳۸ء، بحوالہ فائل مکاتیب غالب طبع اول پر معاصر اخبارات ورسائل کے تبصرے، ص ۳۲۔

۲۲۔ دیباچہ مکاتیب غالب، طبع ثانی، ص۔

۲۳۔ دیباچہ طبع ثانی، مکاتیب غالب، ص ۱۳۔

۲۴۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو دیباچہ مکاتیب غالب طبع ثانی، ص ۱۷۵۔

۲۵۔ دیباچہ مکاتیب غالب، طبع چہارم، تمہید، ص ک۔

۲۶۔ مکتوب عرشی زادہ، بنام راقم الحروف مرقومہ ۲۵/جون ۱۹۸۳ء۔

◆◆◆

پانچواں باب

کلامِ غالبؔ (اُردو) کی جمع وتدوین اور مولانا عرشیؔ

◆◆

تاریخی پسِ منظر میں غالب شناسی کی روایت کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ اس کے اوّلین نقوش کلامِ غالبؔ کی بدولت ظاہر ہوئے تھے۔ غالبؔ کی زندگی میں انھیں شہرت بطور شاعر ہی حاصل ہوئی۔ بطور نثر نگار بعد میں انھیں اہم مقام حاصل ہوا تھا تاہم اپنے کلام اُردو کے بارے میں غالبؔ کے تاثرات کا جائزہ لینے سے ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ وہ تمام عمر اپنے فارسی کلام کو اُردو کلام سے بدرجہا بہتر سمجھتے رہے۔ لیکن جو مقام انھیں اُردو شاعری کے باعث حاصل ہوا اس سے ان کا فارسی کلام محروم رہا۔ غالبؔ کے ہم عصر شعرا کے کلام کی اشاعت وتدوین کا جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ غالبؔ کے علاوہ اس دور کے کسی دوسرے شاعر کو اپنی زندگی میں اتنی مرتبہ اپنا کلام شائع کرانے کا موقع نہیں مل سکا۔ غالباً تاریخِ اَدب میں غالبؔ واحد شاعر ہیں جن کی زندگی میں ان کا کلام کئی مرتبہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہوتا رہا۔ یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ اس شہرت کے باوجود غالب اپنے کلام کو دیکھنے کے لیے ترستے رہے اور انھوں نے اپنے کلام کو مدون کرنے کا کام خود انجام نہ دیا بلکہ ان کے احباب اس کلام کو جمع کر کے شائع کرواتے رہے۔

حاتم علی بیگ مہر کے نام ایک خط میں غالبؔ اپنے کلام کے جمع کرنے کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ نواب ضیاء الدین خان اور نواب حسین مرزا جمع کر لیتے تھے جو مَیں نے کہا انھوں نے لکھ لیا، ان

دونوں کے گھر لٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہو گئے۔
اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کا وہ
خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا
لایا۔ اس نے جو وہ کاغذ مجھ کو دکھایا یقین سمجھنا کہ رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا
ہوں اور صلہ میں اس خط کا جواب چاہتا ہوں۔" ا

غالبؔ کے مندرجہ بالا اقتباس میں جو درد اور سوز و گداز ہے شاید اس کی اثر آفرینی کا نتیجہ ہی تھا کہ غالبؔ کے پرستاروں نے ان کے دیوان کو وقتاً فوقتاً جس قدر دیدہ زیبی اور حُسن و آرائش سے شائع کیا آج غالبؔ کی روح کے لیے یہ امر یقیناً راحت و اطمینان کا باعث ہوگا۔ دیوان کے اس نسخہ کو تو کہنے والوں نے مقدس وید کے مرتبہ کا حامل قرار دیا ہے۔ دیوانِ غالب کے اہم مرتبین میں جن اصحاب کے نام لیے جا سکتے ہیں ان کی تو ایک طویل فہرست ہے۔ البتہ جن احباب کی کاوشوں نے شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ پائی، ان میں جناب منشی انوار الحق، جناب نظامی بدایونی، جناب ڈاکٹر عبداللطیف، جناب عبدالرحمٰن چغتائی، جناب شیخ اکرام، جناب مالک رام، جناب مولانا امتیاز علی خان عرشی اور جناب غلام رسول مہر کے نام سرِ فہرست ہیں، ان کے علاوہ دیگر اساتذہ فن کی کوششوں کو بھی ہمیشہ تحسین کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ مولانا عرشی کی سعی و کاوش پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیوانِ غالب کی مرحلہ وار اشاعت کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا جائے۔

غالبؔ کی زندگی میں دیوانِ غالب کی اشاعتیں:

طبع اوّل (شہر شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۸۴۱ء):

دیوانِ غالب کا پہلا نسخہ سرسید احمد خان کے بھائی سید محمد خان بہادر کے مطبع سید الاخبار سے چھپا۔ اس دیوان کی ضخامت ۱۰۸ صفحات پر مشتمل تھی اور سائز ۸ × ۷ (۷ × ۳") تھا۔ اس نسخہ میں اشعار کی تعداد ۱۰۹۵ ہے۔ اس کے آغاز میں (ص ۳ـ۵) تک

غالبؔ کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیباچہ فارسی زبان میں ہے اور آخر میں (ص ۱۰۴۔ ۱۰۸) تک جناب نیر رخشاں کی وہ تقریظ شاملِ دیوان ہے جو انھوں نے اشاعت سے تین برس قبل (۱۲۵۴ھ) میں لکھی۔ اس دیوان کی اشاعت چوں کہ تین برس بعد عمل میں آئی اس لیے تقریظ میں ۱۲۵ اشعار کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۹ء میں مرتب ہو چکا تھا لیکن اب اس دیوان کا حصول مشکل ہے۔[۲]

طبع دوم:

غالبؔ کی زندگی میں دوسری مرتبہ ان کا دیوان قاضی حوض، دہلی سے مطبع دارالسلام (مطبع صادق الاخبار) قاضی حوض، دہلی سے مئی ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا۔ ضخامت: ۹۸ صفحات، سائز: ۱۰×۷" (۷.۵×۴.۵") اور تعداد اشعار ۱۱۱۱ ہے۔ اس میں طبع اوّل سے ۱۱۶ اشعار زیادہ ہیں۔[۳]

اس اشاعت کے شروع میں (صفحہ ۲۔ ۳) میں غالبؔ کا اپنا فارسی دیباچہ اور آخر میں ص (۹۴، ۹۸) نیر رخشاں کی تقریظ شامل ہے۔

طبع سوم:

دیوانِ غالبؔ کی تیسری اشاعت مطبع احمد، دہلی سے ۲۹ جولائی ۱۸۶۱ء کو ہوئی جس کی ضخامت: ۸۸ صفحات۔ سائز ۱۰×۷" (۸.۲۵×۴.۲۵")۔ تعداد اشعار: ۱۷۹۶۔[۴]

دیوانِ غالبؔ کے تیسرے ایڈیشن کے سلسلے میں غالبؔ نے اس کی طباعت کی اجازت اپنے ایک رفیق اور مطبع احمد کے مالک محمد حسین خان کو دی تھی۔ لیکن موصوف نے یہ ایڈیشن اس قدر غلط چھاپا کہ غالب دل برداشتہ ہو کر رہ گئے۔ پھر غالبؔ نے ایک نسخے پر خود اپنے ہاتھوں سے تصحیح کر کے دوبارہ چھاپنے کی ہدایت کی۔ یہ نادر نسخہ، آصفیہ لائبریری، حیدر آباد دکن میں موجود ہے۔[۴]

طبع چہارم:

طبع سوم میں چوں کہ بہت سی غلطیاں تھیں اس لیے مرزا نے اسے دوبارہ تصحیح کے ساتھ شائع کرانے کا ارادہ کیا۔ طبع سوم سے طبع چہارم کے مرحلے تک کے واقعات پر مولانا غلام رسول مہر رقم طراز ہیں:

"مطبع احمدی والا نسخہ ۲۰ محرم ۱۲۷۸ھ مطابق ۲۸ جولائی ۱۸۶۱ء کو چھپا تھا چوں کہ حد درجہ غلط تھا اس لیے غالبؔ نے از سر نو کان پور میں چھپوانے کا ارادہ کیا۔ چناں چہ اپنے قلم سے مطبوعہ نسخہ پر تمام غلطیاں درست کیں۔ اس کی پشت پر ایک رقعہ محمد حسین خان مالک مطبع احمدی کے نام لکھ کر تصحیح شدہ نسخہ ان کے پاس بھیج دیا۔ محمد حسین خان نے اسے مطبع نظامی کان پور میں چھپوایا۔ ایڈیشن ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ (جون ۱۸۶۲ء) میں مکمل ہوا۔" [۶]

جس کی ضخامت: ۱۰۴ صفحات۔ سائز ۱۰×۷"(۴×۸")

تعداد اشعار: ۱۸۰۲: یعنی طبع سوم سے ۶ شعر زیادہ تھے۔ [۷]

طبع پنجم:

دیوانِ غالب کی پانچویں اشاعت اُستادِ شاہ شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد ظہیر الدین ظہیر دہلوی کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچی۔ یہ ۱۳ اگست ۱۸۶۳ء کو مطبع: مطبع العلوم، سینٹ سٹیفنز کالج، دہلی اور مطبع احمدی واقع شاہدرہ، دہلی سے شائع ہوا۔ اس کی ضخامت: ۱۷۶ صفحات۔ سائز ۱۸×۲۳/۸۔ تعداد اشعار = ۱۴۰۷ تھی۔

دیوانِ غالب کی ان اشاعتوں کے ساتھ ساتھ ایک مرتبہ غالبؔ کا کلام ذوقؔ اور مومنؔ کے کلام کے ساتھ بھی نگارستان سخن کے نام سے یک جا چھپا۔ تاہم اس نسخہ کی کوئی جلد دستیاب نہیں۔ یہ بھی پہلے دیوان کی طرح ناپید و نایاب ہے۔ [۸]

طبع ششم :۔

غالبؔ کی زندگی میں شائع ہونے والی اشاعتوں میں یہ آخری اشاعت ہے۔ چھٹی اشاعت آگرہ سے ۱۸۶۳ء میں مکمل ہوئی، جو منشی شیو نرائن کے اہتمام سے شائع کی گئی اور مطبع مفید خلائق نے اس نسخہ کو چھاپا۔ اس کی ضخامت: ۱۴۶ صفحات۔ سائز ۱۰.۵ × ۶.۵"(۵×۸/۲۵")۔ ۹

وفات کے بعد کلامِ غالبؔ کی اشاعت:

مرزا کی وفات سے قبل بہت سے حضرات خطوطِ غالبؔ جمع کرنے اور چھپوانے میں مصروف رہے۔ اس لیے ان کی وفات کے فوراً بعد خطوط ہی منظرِ عام پر آئے۔ غالبؔ کی وفات سے لے کر اب تک ان کے خطوط کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے تاہم دیوانِ غالب کے بھی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں غالبؔ شناسی کی روایت کو مربوط کرنے میں تنقیدی کتب نے اور سوانح نگاری کے فن نے بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ بیسویں صدی کے شروع میں کلامِ غالب کے چند نمایاں نسخے درج ذیل ہیں :

دیوانِ غالب (پاکٹ ایڈیشن)

مرتب: سر شیخ عبدالقادر۔ بیرسٹر ایٹ لاء۔

مطبع : گلزار محمدی اسٹیم پریس، لاہور۔

ضخامت : ۲۵۲ صفحات۔

اس دیوان کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں غالبؔ کی ایک عکسی تصویر بھی پیش کی گئی ہے۔ اس دیوان کے ابتدائی چھ صفحات میں دیوان کی تکمیل کے مراحل کا ذکر کیا گیا ہے۔ سولہ صفحات میں غالبؔ کے سوانحی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ دیوان دو مقامات پر مرتب ہوا۔ ایک حصہ تو سر عبدالقادر کے قیام دہلی کی یادگار ہے اور دوسرا سرکاری ملازمت میں تبادلے کے سلسلے میں لائل پور آنے پر مکمل ہوا۔

دیوان غالب جدید معروف بہ نسخۂ حمیدیہ

مقدمہ : جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری۔

مرتبہ : مفتی محمد انوارالحق ایم۔اے، ڈائریکٹر محکمہ تعلیمات ریاست، بھوپال۔

سرنامہ: نواب زادہ کرنل محمد حمید اللہ خان صاحب چیف سیکرٹری ریاست بھوپال جن سے اس نسخہ کا انتساب کیا گیا ہے۔

مطبع : مفید عام اسٹیم پریس، آگرہ۔

ضخامت : ۳۳۲ صفحات۔

بیسویں صدی کے شروع میں دیوانِ غالب کی اشاعتوں میں اس ایڈیشن کو خاص مقام حاصل ہے۔ اس دیوان کی پہلی منفرد خصوصیت تو اس کلام کی اشاعت تھی جو ابھی تک دنیا کی نظروں سے اوجھل تھا تاہم اس کی دوسری اہمیت اس دیوان کے ساتھ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے تحریر کردہ مقدمہ کی اشاعت تھی۔ جس میں موصوف نے غالب کے کلام کو مقدس وید کا درجہ دیا اور مغربی مفکرین کے ساتھ کلامِ غالب کا موازنہ کرتے ہوئے اس میں الہامی عناصر کی نشان دہی کی۔ بعد میں یہی مقدمہ الگ کتابی صورت میں محاسن کلامِ غالب کے نام سے بھی شائع ہوا۔ اس دیوان میں غالب کا وہ تمام کلام تھا جو انھوں نے اپنا متداول دیوان شائع کرتے ہوئے قلم زد کرایا تھا۔ خوش قسمتی سے اس اصل دیوان کا ایک نسخہ کتب خانہ حمیدیہ بھوپال میں محفوظ تھا۔ یہ نسخہ نواب غوث محمد خان کے صاحب زادے میاں فوجدار محمد خان کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس دیوان میں وہ تمام غزلیں موجود ہیں جو مروجہ دیوان میں شامل نہ تھیں۔ بایں ہمہ وہ اشعار بھی اس میں موجود ہیں جو متفرق طور پر تلاش کر کے دیوان میں اضافہ کرتے رہے۔ اس دیوان کے دیباچہ میں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ دیوانِ غالب کی نظر سے بھی گزرا ہے۔ جس میں غالب نے حاشیہ میں اپنے ہاتھ سے تصحیح کی ہے۔ غالب کا یہ کلام بالکل ابتدائی زمانہ کا ہے۔ جس سے موصوف کے شاعرانہ ذہنی ارتقاء کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ دیوان کو ترتیب دیتے وقت غالب کی عمر

صرف پچیس برس تھی۔ اس دیوان میں غالب کی وہ شبیہ جس میں انھیں قصیدہ پڑھتے دکھایا گیا ہے وہ بھی موجود ہے۔ اس دیوان کی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر وحید قریشی رقم طراز ہیں:

"غالب کے تدوین کلام کا کوئی جائزہ دیوانِ غالب اردو کے دو نسخوں کے ذکر کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔ اول نسخۂ بھوپال، جسے قاضی انوار الحق ابن مولانا نوگی نے متداول دیوانِ غالب اور بعض دیگر اشعار کے اضافے کے ساتھ ۱۹۲۱ء میں بھوپال سے شائع کیا۔ دوم پنجاب یونی ورسٹی لائبریری، لاہور کا وہ مخطوطہ جو ذخیرۂ شیرانی میں ہے اور ۱۹۴۲ء سے قبل مشہور محقق حافظ محمود شیرانی کی ملکیت تھا۔"۱۰۰

نسخۂ حمیدیہ کے بعد دیوانِ غالب کا ایک اہم ایڈیشن نظامی بدایونی نے مرتب کیا۔ یہ نظامی پریس بدایون سے ۱۹۲۳ء میں چھپا۔ اس کی ضخامت ۱۴۰ صفحات ہے۔ اس کے شروع میں غالب کے ہی خطوط سے ان کی خودنوشت سوانح عمری ترتیب دی گئی ہے۔ اس دیباچے کے پڑھنے سے بھی پتہ چلتا ہے کہ نظامی مرحوم نے ۱۹۱۵ء میں بڑے اہتمام کے ساتھ اسے شائع کیا اور پھر ۱۹۱۸ء اور ۲۱۔۱۹۲۰ء میں شرح کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے متن کی بنیاد غالباً رام پور کے قلمی نسخے پر رکھی گئی ہے۔

اس کے بعد ایک خاص نسخۂ مرزا عبدالغفار افغانی کی فرمائش پر ۱۹۲۵ء (۱۳۴۴ھ) میں مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ نے شائع کیا۔ اس کی اشاعت شرکت کاویانی برلن (جرمنی) سے ہوئی۔ اس کی ضخامت ۲۷۶ صفحات تھی۔ اس دیوان کے شروع میں بھی غالب کا فارسی دیباچہ موجود ہے۔ البتہ اصنافِ سخن میں خاتمے کے لیے ہر صنفِ سخن کے بعد تین تین ستارے ختمِ کلام کی علامت کے طور پر بنائے گئے ہیں۔ اس دیوان پر خوب صورت سنہری بیل بوٹوں والی جلد ہے۔ جس کی حفاظت کے لیے گتّے کے ڈبے کو استعمال کیا گیا ہے۔"۱۱

اس دیوان کی ایک اور نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں یائے معروف اور یائے مجہول دونوں کو ایک ہی شکل میں لکھا گیا ہے۔ آخر میں چند صفحے "بیاض" لکھ کر چھوڑ دیے

گئے ہیں۔

دیوانِ غالب کی اشاعت میں جس ایڈیشن کو ایک نعرہ مستانہ تصور کیا گیا وہ نسخہ بھوپال تھا۔ ابھی نسخہ بھوپال کی یاد تازہ ہی تھی کہ مصورِ مشرق جناب عبدالرحمن چغتائی نے دیوانِ غالب کے مصور ایڈیشن کو دنیا کے سامنے پیش کر کے مغلیہ دور کی روح کو پیکرِ تصویر میں ڈھال دیا۔ جناب عبدالرحمن چغتائی کا یہی ایڈیشن مرقع چغتائی اور پھر نقشِ چغتائی کے نام سے بالترتیب ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئے۔ مرقع چغتائی کے ناشر جہاں گیر بک کلب، چابک سواراں، لاہور تھے اور مطبع اورینٹل آرٹ پرنٹنگ ورکس، لاہور تھا۔ اس دیوان کا تعارف ڈاکٹر جے۔ ایچ کزنز وی نے اور پیش لفظ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے انگریزی میں تحریر کیا۔ اس کی ضخامت ۱۱۸ صفحات ہے۔ چغتائی صاحب کے قلم سے مختصر سی تقریظ میں یہ کہا گیا ہے کہ انھوں نے ایشیائی تہذیب کی روح کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کے بہترین نمائندے غالب تھے۔ دیوان میں شامل تصویروں کی تعداد ۳۳ ہے جن میں سے چھے سادہ اور ۲۷ رنگین ہیں۔ ہر تصویر سے قبل ایک سادہ کاغذ پر غالب کا ایک مصرعہ یا شعر تحریر کر کے اس تصویر کی معنویت بیان کر دی گئی ہے۔ اس مرقع کی کتابت تو ۱۹۲۸ء میں مکمل ہو گئی تھی لیکن جرمنی سے بروقت طبع ہو کر نہ آ سکنے کے باعث اس کی اشاعت میں تاخیر ہوئی۔[۱۳]

اسی دوران میں ڈاکٹر عبداللطیف کا مرتبہ دیوان شائع ہوا۔ ڈاکٹر لطیف نے اپنی مشہور انگریزی کتاب غالب میں جہاں غالب کی شاعرانہ خصوصیات کا جائزہ لیا وہاں اس بات پر بھی زور دیا کہ ہمیں غالب کو سمجھنے کے لیے اس کے کلام کو تاریخی ترتیب سے شائع کرنا ہوگا۔ اس سے ہم غالب کے بارے میں کوئی متوازن رائے قائم کر سکیں گے۔ لیکن ڈاکٹر موصوف نے اپنا کام ادھورا ہی چھوڑ دیا اس لیے صرف آدھا حصہ ہی مرتب ہو کر سامنے آیا۔

اس کے بعد دیوانِ غالب کو تاریخی ترتیب سے چھاپنے کی اگلی کاوش ۱۹۳۶ء

میں شیخ اکرام کی ہے۔ انھوں نے اُردو کلام کے ساتھ ساتھ فارسی کلام کو بھی مختلف ادوار میں تقسیم کر کے آثارِ غالب کے نام سے شائع کیا لیکن شیخ اکرام سے یہ غلطی ہوئی کہ انھوں نے تصحیح کے کام کو نظر انداز کر دیا اور متداول دیوان کے حصے کو بھی ایک جگہ نہیں رکھا۔ اس سے اصل دیوان میں انتشار سا پیدا ہو گیا تھا۔[۱۳]

دیوانِ غالبؔ کی عکسی اشاعت کا جو سلسلہ عبدالرحمٰن چغتائی نے شروع کیا تھا، اس کے نقشِ قدم پر تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور نے اپنے منفرد انداز میں ۱۹۳۸ء میں ایک عکسی رنگین ایڈیشن شائع کیا، اس دیوان کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں دیوان کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا۔ طباعت کی دل آویزی کا مقدور بھر خیال رکھا گیا ہے۔ قواعد و علائم اور املا پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ خوش خطی کا بہترین نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ کاغذ سفید اور بہترین استعمال کیا گیا ہے اور آخر میں وہ اشعار اور قطعات شامل کیے گئے جو مروجہ دواوین میں نہ تھے۔ اس دیوان کے بارے میں رسالہ ''العلم'' میں ان خیالات کا اظہار کیا گیا ہے:

> ''دیوان اتنا پیارا، دل افروز اور باصرہ نواز ہے کہ اسے چھوتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں ہاتھ لگانے سے میلا نہ ہو جائے۔ دیوانِ غالب کے ایڈیشنوں میں حُسن و جمال کے لحاظ سے یہ دیوان ''قُرّۃ الناظرین'' کی صحیح تفسیر پیش کرتا ہے۔''[۱۴]

۱۹۳۸ء میں ہی دیوانِ غالب کا ایک اور خاص ایڈیشن پیرزادہ ابراہیم حنیف نے مرتب کیا۔ اس کے ناشر شیخ محسن علی پروپرائیٹر مظفر علی بک ڈپو، اندرون لوہاری گیٹ، لاہور تھے۔ اس کی ضخامت ۲۰۰ صفحات ہے۔ اس دیوان کے دیباچہ میں رائج الوقت نسخوں کے متن پر شک و شبہ کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس دیوان کو حقیقی متن سے قریب تر ہونے کے لیے جن دواوین سے استفادہ کیا گیا ہے ان میں غالب کی زندگی میں شائع ہونے والا دوسرا ایڈیشن ہے۔ قاضی حوض، دہلی سے ۱۸۴۷ء میں چھپا تھا۔ اس دیوان کو سہولت کی خاطر ردیف وار مرتب کیا گیا اور ردیف الف کے اشعار خواہ کسی بھی صنفِ سخن سے تھے انھیں یک جا کر دیا

گیا ہے۔ طرز کتابت میں سررشتہ تعلیم کے طریق کار کو اختیار کیا ہے۔ اور جملہ ہائے معترضہ کو علامتوں سے واضح کیا گیا ہے۔ دیوانِ غالب طبع دوم کی ترتیب ۱۸۳۸ء میں نواب ضیاء الدین کے ہاتھوں مکمل ہوگئی تھی لیکن اشاعت بعد میں ہوئی اس لیے اس نسخہ کو غالب کے مذکورہ ایڈیشن کی صد سالہ یادگار کے طور پر شائع کیا گیا۔

دیوانِ غالب کے ان ایڈیشنوں میں منفرد اضافہ مولانا عرشیؔ کے مرتبہ انتخاب غالب کی صورت میں ہے۔ اس کی اشاعت ۱۹۴۲ء کو ہوئی۔ اس انتخاب کی فنی اور بنیادی خصوصیات کا تفصیلی جائزہ گزشتہ باب میں پیش کیا جا چکا ہے۔

اس دوران میں دیوانِ غالب کے مختلف جگہوں سے بے شمار ایڈیشن شائع ہوتے رہے تاہم اس سلسلہ کی ایک اہم اشاعت جناب مالک رام کا مرتب کردہ دیوان ہے جو ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے ناشر آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی اور مطبع یونین پرنٹنگ پریس، دہلی ہے۔ اس کی ضخامت ۳۵۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ دیوان میں شامل مبسوط مقدمہ میں کلامِ غالب کی جمع و تدوین پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ نیز غالب کی زندگی میں شائع ہونے والے پانچ ایڈیشنوں کے طباعتی مراحل کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اس دیوان کے متن کو مستند طرز پر شائع کرنے کے لیے جن نسخوں سے مدد لی گئی ان کا تفصیلی ذکر بھی موجود ہے۔ ان میں نظامی ایڈیشن، غالب کی زندگی میں چھپنے والا پانچواں ایڈیشن۔ اثنائے غالب کا قلمی نسخہ، اردوئے معلیٰ اور انتخاب غالب مرتبہ مولانا عرشیؔ، دیوانِ غالب نسخہ بھوپال، نادراتِ غالب مرتبہ آفاق حسین آفاق دہلوی اور گلستانِ سخن دہلی شامل ہیں۔

اس ایڈیشن کے آخر میں ۱۸۶۲ء کے نظامی ایڈیشن میں شامل نہ ہونے والا کلام بھی شائع کر دیا ہے۔ نسخہ حمیدیہ سے بھی انتخاب شاملِ دیوان کیا گیا ہے اور حواشی میں مختلف نسخوں میں اختلاف و فرق کی بھی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

مالک رام کے بعد دیوانِ غالب کا ایک ایڈیشن وہ ہے جسے پروفیسر سید

احتشام حسین نے ۱۹۵۸ء میں مرتب کیا۔ یہ کتاب نگر ایڈیشن کے عنوان سے لکھنؤ کے مطبع تنظیم پریس سے شائع ہوا۔ اس کی ضخامت ۱۶۷ صفحات ہے۔ دیباچہ میں پروفیسر موصوف نے دیوانِ غالب پر دیباچہ لکھ کر اس کی خوبیاں بیان کرنے کے برعکس کلامِ غالب زیادہ سے زیادہ صحت کے ساتھ شائع کرنے پر زور دیا ہے۔ لیکن یہ امر حیران کن ہے کہ اس کے باوجود پروفیسر سید احتشام حسین نے بذاتِ خود ۱۸ صفحے کا طویل دیباچہ سپردِ قلم کیا ہے۔ غالبؔ کے شاعرانہ ارتقاء کا جائزہ لیتے ہوئے آپ کا خیال ہے کہ عمر کے درمیانی حصے میں غالبؔ اُردو کے بجائے فارسی پر توجہ دینے لگے تھے اور اُردو کی طرف دوبارہ ان کا رجحان ملازمت قلعہ اور اُستادِ شاہ ہونے کے بعد ہوا۔ اس کے علاوہ پروفیسر سید احتشام نے اہم غالبؔ شناسوں کا تذکرہ بھی ضروری سمجھا ہے۔ اس ایڈیشن کی بنیاد ۱۸۶۲ء کے اس نسخہ پر رکھی گئی ہے جس کی تصحیح خود غالبؔ نے اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔

دیوانِ غالب کے بہترین ایڈیشنوں میں جہاں مرقع چغتائی، تاج کمپنی ایڈیشن اور نسخہ بھوپال یادگار تصور کیے جاتے ہیں وہاں ۱۹۵۸ء میں علی سردار جعفری کا مرتبہ ہندی و اُردو دیوان بھی کسی طرح کم اہم نہیں ہے۔ یہ مطبع اَدبی پرنٹنگ پریس بمبئی نمبر ۸ سے شائع ہوا۔ اس کی ضخامت ۴۷۱ صفحات ہے۔ شروع میں غالبؔ کے حالاتِ زندگی بہت مختصر ہیں جن میں نام پیدائش اور وفات تک کا محض ذکر کر دیا گیا ہے۔ اس ایڈیشن کے تمام حصوں کے ہر طاق صفحہ پر متن اور جفت صفحہ پر ہندی ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ مرتب نے غالبؔ کے حالات زندگی اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں قلم بند کیے ہیں اور غالبؔ کے ذہن کے نفسیاتی گوشوں کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ مرتب کے خیال میں غالبؔ کی طبیعت میں شعر گوئی کا ملکہ فطری طور پر موجود تھا۔ اس کے ساتھ ہی غالبؔ کی تمام زندگی جس انداز میں بسر ہوئی اس کے محرکات کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دیوان کے ساتھ دیباچہ شائع نہ کیا جاتا تو دیوان بے جان رہتا۔ غالبؔ کی شاعرانہ خصوصیات میں اس کے تصورِ حسن و عشق، صوفیانہ روش کا بھی بیان موجود ہے نیز فاضل مرتب کے خیال میں

غالبؔ وحدت الوجود کا قائل تھا۔ اس ایڈیشن کے متن کی بنیاد مالک رام کے مرتبہ نسخے کو بنایا گیا ہے۔ لیکن اعراب کے سلسلے میں مالک رام سے بعض مقامات پر اختلاف موجود ہے۔[15] البتہ مالک رام کے اعراب کو بدلا نہیں گیا۔ اس کے ساتھ ہی دیباچہ کے آخر میں دیوناگری رسم الخط پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اس دیوان کی ترتیب میں جن لوگوں نے فاضل مرتب کی مدد کی۔ ان کے بارے میں رسالہ ''العلم'' کراچی میں لکھا گیا ہے:

''اس دیوان کی ترتیب اور اسے حسین وجمیل شکل میں پیش کرنے کی خدمت مس سیار نے انجام دی۔ مفتی صاحب نے غزلوں کو دیوناگری میں منتقل کیا ہے اور پریم سروپ شرما نے ہندی فرہنگ مرتب کرنے میں معاونت کی ہے۔ یہ فرہنگ الگ جلد میں ۸۲ صفحات پر شائع کیا گیا ہے۔''[۱۶]

مولانا عرشیؔ کے مرتبہ دیوانِ غالب کے منظرِ عام پر آنے تک اس کی اشاعتوں کو ترتیب وار پیش کرنے کے بعد اب براہِ راست مولانا عرشی کی سعی و کاوش کا جائزہ پیشِ خدمت ہے۔

دیوان غالب:

نسخۂ عرشی: دیوانِ غالب کی اب تک جتنی بھی اشاعتیں ہوئیں ان میں کسی نہ کسی طرح کمی ضرور رہ گئی۔ مولانا عرشیؔ نے اپنے مرتبہ دیوان میں کلامِ غالبؔ کے سلسلے میں ہر طرح کی تشنگی کو دُور کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور غالبؔ کا تمام مرتبہ اور غیر مطبوعہ کلام پہلی مرتبہ یک جا کر کے شائقینِ اَدب کی دیرینہ خواہش کو پورا کیا۔ مولانا کے خیال میں اس کام کو منزلِ مقصود تک پہنچانا کسی طرح بھی جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ اس دیوان کے دیباچہ میں مولانا عرشیؔ اس محنت پژوہی اور ژرف نگاہی کے صلے کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کتاب خانہ رام پور کی طرف سے ۱۹۴۲ء میں انتخاب غالب شائع ہوا تو ملک کے اہلِ نظر طبقے نے اس کام کو پسندیدگی کی نگاہ سے

دیکھا اور ایک دیدہ ور عالم نے مرتب سے فرمائش کی کہ انتخاب پر غالب کے مکمل دیوان کا بھی ایک نسخہ تیار کیا جائے۔ مرتب اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ کام جوئے شیر لانے سے کم ثابت نہ ہوگا۔ مگر اس بزرگانہ خواہش کی پشت پر وہ دل چسپی کام کر رہی تھی جو اسے بچپن سے کلامِ غالب سے ہے۔ اس لیے اس کا وعدہ کر لیا اور کئی برس کی دیدہ ریزی کے بعد یہ نسخہ مرتب کیا جو ملک کے اربابِ فضل و کمال کے سامنے ہے۔"[۱۷]

چناں چہ دیوانِ غالب نسخہ عرشی طبع اوّل کا تعارف کچھ یوں ہے:

سنِ اشاعت	۱۹۵۸ء
تعداد	ایک ہزار
اہتمام	انجمن ترقی اُردو، ہند، علی گڑھ۔
طباعت	ہندستان پرنٹنگ ورکس، رام پور۔
ضخامت	چھ سو چھتیس صفحات
قیمت	بیس روپے

موٹے سفید کاغذ پر نسخ ٹائپ نے اس دیوان کی دیدہ زیبی میں بھی اضافہ کیا ہے۔ دیوان کا انتساب جناب آصف علی اصغر فیضی کے نام کیا گیا ہے۔ جن کی پر خلوص فرمائش پر یہ کام تکمیل کو پہنچا۔ دیوان کی ترتیب اس طرح سے ہے:

تقریب	ز۔ح
دیباچہ	۱۔۱۲۰

دیباچہ کو مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں مرزا کے حالاتِ زندگی سے لے کر اُن کے شاعرانہ کمالات ہر فن زندگی کے اہم پہلوؤں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ دیباچہ میں شامل عنوانات کی تفصیل اس طرح ہے:

سرگزشت، تعلیم، اُستاد، مطالعہ، تتبع اساتذہ، راہِ سخن کے عوامل، اصل الاصول، بیدلانہ فارسی، تتبع لہجہ، تصوف و نجوم، شعر گوئی، تخلص، اُستادِ شعر، ریختہ گوئی، پہلا دور، دوسرا

دور، فارسی نگاری، تدوینِ اشعار، دیوانِ اُردو، نسخہ بھوپال، نسخہ شیرانی، گلِ رعنا، متداول دیوان، کس نے انتخاب کیا، معیارِ انتخاب، مقدارِ انتخاب، تاریخ انتخاب، آخری انتخاب، طرزِ سخن، تعریفِ سخن، تعریفِ شعر، اوصافِ شعر، عیوبِ شعر، صنائع لفظی، میزانِ شعر، سہلِ ممتنع، شرکتِ مشاعرہ، کلکتے کے مشاعرے، دہلی کے مشاعرے، اخبار میں اشاعتِ اشعار، بھبتی یا مدح، ہزل و ہجو، ناقدر دانی عصر، ہنگامۂ کلکتہ، قیدِ دہلی، شعر گوئی متروک جدید ترتیب دیوان، مشتملات، ترتیبِ اشعار، اختلافِ نسخ، زیرِ مطالعہ نسخے، قلمی نسخے، نسخۂ بھوپال، نسخۂ شیرانی، گلِ رعنا، نسخۂ رام پور، نسخۂ لاہور، نسخۂ رام پور جدید، انتخابِ غالبؔ، مطبوعہ نسخ، پہلا ایڈیشن، دوسرا ایڈیشن، تیسرا ایڈیشن، چوتھا ایڈیشن، پانچواں ایڈیشن، نسخہ بھوپال (حمیدیہ) لطیف ایڈیشن، ماخذوں کی تاریخی ترتیب، شرح غالب، فہرست اشعار، اشارے، املا ورسم خط، علامات وقف، تصاویر، فروگزاشت، شکریہ۔

۱۴۰ صفحات کے مبسوط دیباچے کے مندرجہ بالا تمام عنوانات اور صفحات کا مکمل اشاریہ کے بعد فہرست میں حصہ کلام کی تفصیل اس طرح سے ہے:

گنجینۂ معنی ا۔۱۱۸ صفحات

قصائد ۲ غزلیات ۱۱۔۱۱۶

الف ۱۱، ب ۳۱، ت ۳۲، ث ۳۳، ج ۳۴، چ ۳۵، ح ۳۷، ز ۳۷، ر ۳۹، ز ۴۳، س ۴۵، ش ۴۶، ع ۴۷، غ ۴۸، ف ۴۹، ک ۴۹، گ ۵۰، ل ۵۱، م ۵۳، ط ۵۵ و ۶۷، ہ ۷۰، ی ۷۳۔

رباعیات ۱۱۷ صفحہ۔

....

نوائے سروش ۱۱۹ ۔ ۲۵۸ صفحات

دیباچہ ۱۲۰

قطعات ۱۲۲

....

دیوانِ غالب کا یہ ایڈیشن چوں کہ انجمن ترقی ہند کی اعانت سے ترتیب دیا گیا ہے اس لیے اس کے شروع میں انجمن کے سیکرٹری جنرل جناب آل احمد سرور نے "تقریب" کے عنوان سے تحریر میں مولانا عرشی کی اس علمی کاوش پر انھیں خراجِ تحسین پیش کیا ہے علاوہ ازیں اس ایڈیشن سے قبل جتنے بھی نسخے شائع ہوئے ان میں اس نسخہ کی اہمیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے چناں چہ تقریب میں جناب آل احمد سرور لکھتے ہیں:

"غالبؔ کے کلام کے جتنے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں ان میں نسخہ حمیدیہ (انوارالحق)، ارمغان غالبؔ (اسلام)، انتخاب غالبؔ (عرشی) اور دیوانِ غالب (مالک رام) کی خاص اہمیت ہے۔ غالبؔ کے تنقیدی شعور کے مطالعے کے لیے ان نسخوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ڈاکٹر

عبداللطیف کو سب سے پہلے غالبؔ کے سارے اُردو کلام کو تاریخی ترتیب کے ساتھ جمع کرنے کا خیال آیا تھا...... زیرِ نظر ایڈیشن جو اُردو کے مشہور محقق اور غالبیات کے ماہر جناب امتیاز علی عرشیؔ کی برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ نہ صرف ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے بل کہ کلام کی تاریخی ترتیب اور صحت، نسخوں کے اختلاف کی نشان دہی، شرح اور ضروری حواشی کے لحاظ سے۔ اب تک کی ساری کاوشوں پر معیاری اور اُردو میں اَدبی تحقیق اور عالمانہ نظر کا ایک قابلِ فخر اور ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔[۱۸۰۰]

''تقریب'' کے بعد فاضل مرتب مولانا عرشیؔ کا دیباچہ شروع ہوتا ہے۔ آغاز میں ہی غالبؔ کی ایک عکسی تصویر بھی شامل ہے۔ جس میں غالب کرسی پر بیٹھے ہیں اور نیچے ان کا معروف مصرع لکھا گیا ہے :

ع اب وہ رعنائی خیال کہاں

پیش تر اس کے کہ زیرِ نظر ایڈیشن میں کلامِ غالبؔ کی تفصیل پر غور کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مبسوط دیباچہ کی خاص خاص باتوں کا تذکرہ کر دیا جائے۔

خطوطِ غالبؔ کو جمع کرتے ہوئے بھی مولانا عرشیؔ نے انھیں پیش کرتے وقت مرزا کی سوانح کے لیے ان کے اپنے خطوط کا سہارا لیا تھا۔ اسی نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس دیوان کے دیباچہ میں بھی غالب کی سوانح حیات ان کی تحریروں اور ان کے خطوط کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے۔ سوانح کے ساتھ ہی غالبؔ کے شعری رجحانات کو بھی دیباچہ میں موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ شاعری کے آغاز میں غالب جس طرح قدیم اساتذۂ فارسی اور بیدل کی پیروی کرتے تھے۔ اس پر بھی مثالوں سے روشنی ڈالی ہے۔ نیز مرزا کی علمی صلاحیتوں اور مشاہدۂ فطرت جیسی خوبیوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

غالبؔ کے شاعرانہ ذہنی ارتقاء کا جائزہ لینے کے لیے کلام غالب کو مختلف اَدوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ غالبؔ نے اپنی شاعری کے آغاز کے بارے میں جو مختلف بیانات

دیے ہیں مولانا نے ان ہی تحریروں کی روشنی میں بتایا ہے کہ غالب نے اپنی شاعری کا آغاز پندرہ برس کی عمر کے لگ بھگ کیا اور ۲۵ برس کی عمر میں اپنا پہلا دیوان بھی مرتب کرلیا۔ غالب کی شعر گوئی کا آغاز تو اُردو شاعری سے ہوا تھا۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے فارسی کی طرف توجہ دینی شروع کردی۔ ان کی شاعری کا پہلا دور ۲۵ برس تک کے کلام پر محیط ہے۔

دوسرے دور کو مولانا عرشی نے ۲۵ سال کے بعد سے لے کر اُستاد شاہ ہند (بہادر شاہ ظفر) ہونے تک پھیلایا ہے۔ ان کے خیال میں اس عرصہ میں آتش پارسی سے اپنے دل و دماغ کو گرم اور آسودہ کرتے رہے لیکن اس دوران بھی کبھی کبھار اُردو میں کہہ لیا کرتے تھے۔ لیکن بہادر شاہ کے دربار سے وابستگی نے انھیں دوبارہ اُردو کی طرف متوجہ کردیا۔ مولانا عرشی لکھتے ہیں:

> ”سنہ ۱۸۵۰ء میں قلعے سے تعلق پیدا ہوا، تو شاہ ظفر کی بدولت ان کی ریختہ گوئی نے دوبارہ جنم لیا، اور شاہی مشاعروں کے لیے مختلف طرحوں میں آزمائی کرنے لگے۔“[۱۹]

اس دور کے بعد مولانا عرشی نے غالب کی فارسی گوئی پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور مولانا عرشی کے خیال میں غالب اپنے پہلے دور میں بھی تیغ اصفہانی کے ہی گھائل تھے۔ اس لیے ان کے یہاں اُردو کلام پر فارسی کا اثر غالب نظر آتا ہے۔

غالب کی شاعری کی ابتدا اور ارتقا کا جائزہ لینے کے بعد دیباچہ میں مرحلہ وار دیوانِ غالب کی اشاعتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ غالب نے اپنی زندگی میں کتنی بار اپنے کلام کا انتخاب کیا اور یہ کس کس مقام سے شائع ہوتا رہا۔ اس پر سیر حاصل تبصرہ مولانا عرشی کی تحقیقی صلاحیتوں کا شاہد ہے۔ غالب کی زندگی میں آخری انتخاب جو انھوں نے کسی کو پیش کیا مولانا عرشی کے مطابق ۱۸۶۶ء کا وہ انتخاب ہے جو انھوں نے نواب خلد آشیان کی فرمائش پر رام پور بھیجا تھا۔ دیباچہ میں غالب کے ان خطوط کو بھی پیش کیا گیا ہے جو انتخاب کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً اطلاع کے لیے رام پور تحریر کیے جاتے رہے۔

دیباچہ میں پیش کردہ مباحث میں ایک اہم مسئلہ ہے جس میں غالبؔ کی شاعری کے بارے میں ان کے نظریات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ غالبؔ کے نزدیک معیار شعر اور اوصاف شعر کے کیا معیارات تھے۔ انھیں غالبؔ کی تحریروں سے ثابت کیا ہے۔ شعر کے اختتام کے بارے میں اس دیباچہ میں غالبؔ کی رائے کو پیش کیا ہے۔ مرزا غالبؔ تفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ایک خیال رکھا کرو کہ شعر کے اخیر میں کوئی بات ایسی آ جائے کہ جس سے اختتام کے معنی پیدا ہوا کریں۔''[۲۰]

شعر گوئی کے اوصاف میں جن اُمور میں غالبؔ اپنے آپ کو کوتاہ تصور کرتے تھے۔ ان میں تاریخ گوئی کی صلاحیت نہ تھی۔ اس کی مثال کے لیے دیباچہ میں غالبؔ کا خط بھی شامل کیا گیا ہے۔ غالبؔ کی اس شعری کمزوری پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا عرشی لکھتے ہیں:

''لفظی صنعتوں سے پرہیز کا یہ نتیجہ نکلا کہ مرزا صاحب معما اور تاریخ گوئی میں اچھی دستگاہ پیدا نہ کر سکے۔ معما تو شاید انھوں نے ایک بھی نہیں لکھا۔ البتہ تاریخیں ضرور لکھی ہیں، مگر وہ بھی زیادہ تر جوانی کے زمانے کی کہی ہوئی ہیں۔ جب کہ قوئی فکری میں اضمحلال پیدا نہیں ہوا تھا، اور پھر بھی تعیہ و تخرجہ سے بہت کم خالی ہیں۔''[۲۱]

غالبؔ کے شعری طریق کار کے بارے میں غالبؔ کا ایک اقتباس دیباچہ سے پیش خدمت ہے:

''بچپن میں جب میں ریختہ کہنے لگا ہوں، لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش نظر رکھ لیے ہوں، صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل اور قصیدہ لکھنے لگا۔''[۲۲]

شاعرانہ خصوصیات اور شعری رجحانات کے بعد دیباچہ میں ان مشاعروں کا ذکر بھی کیا گیا ہے جن میں غالبؔ اپنی زندگی میں شریک ہوتے رہے۔ ان میں دہلی اور کلکتہ دونوں شہروں کے مشاعروں کے دن، اوقات اور تاریخ پر بھی دلائل دیے ہیں۔ جن سے یہ ثابت کرنے

کی کوشش کی ہے کہ کن مشاعروں میں غالبؔ نے شرکت کی اور کن مشاعروں میں انھوں نے محض اپنی غزل ہی بھیج دی۔ غالبؔ کی اَنا اور خودداری کو ثابت کرنے کے لیے دیباچہ میں بھٹئی یا مدح کا عنوان استعمال ہوا ہے، جس کے تحت غالبؔ کی فطری صلاحیت خودداری اور انانیت کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ غالبؔ کی طبیعت میں جس طرح تہذیبی رچاؤ تھا اور وہ سطح سے گری ہوئی بات کرنا اپنے لیے کسرِ شان تصور کرتے تھے۔ مولانا عرشیؔ کے خیال میں اسی لیے غالبؔ ہزل و ہجو سے پرہیز کرتے رہے۔

ان اُمور کے علاوہ مرزا کو اپنے عہد سے جو نا آسودگی اور ناقدری کا گلہ رہا ہے اس پر بھی مولانا نے غالبؔ کی شخصیت کا نفسیاتی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں ہنگامہ کلکتہ کے مضمرات اور قید دہلی جیسے واقعات نے غالبؔ کی زندگی پر جو اثر ڈالا ان کا بھی اس دیباچہ میں صحیح نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

دیباچہ کی چیدہ چیدہ خصوصیات کا جائزہ لینے کے بعد دیباچہ کے اس حصہ کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جس میں اس نسخہ کو ترتیب دینے اور اس کے بارے میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر مولانا عرشیؔ نے کلامِ غالبؔ کو تین الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصے کا نام غالبؔ کے اشعار کی معنویت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے کسی شعر پر رکھا گیا ہے۔ اس دیوان میں شامل کلام کے بارے میں مولانا عرشیؔ لکھتے ہیں :

> "اس نسخہ میں میرزا صاحب کا وہ سب کلام شامل ہے جو اب تک ان کے نام سے شائع ہوا تھا یا مجھے اپنے مطالعہ اور دوستوں کے لطف و کرم سے حاصل ہوا۔" [۲۳]

دیوان کے زیرِ نظر نسخے کے تینوں اجزاء کی تفصیل الگ الگ پیشِ خدمت ہے۔

۱۔ حصۂ اوّل: گنجینۂ معنی

اس حصہ میں غالبؔ کا وہ تمام کلام موجود ہے جو نسخہ حمیدیہ یا نسخہ شیرانی میں موجود

تھا۔ لیکن مرزا نے اپنے متداول دیوان کی اشاعت کے وقت اسے قلم زد کر دیا تھا۔ مولانا عرشی کے خیال میں چوں کہ اس حصے کے تمام اشعار خیال آرائی اور معنی آفرینی کا طلسمی نمونہ تھے۔ چناں چہ اس حصہ کا نام تجویز کرتے ہوئے اس کی بنیاد غالبؔ کا یہ مشہور شعر بنا کہ:

گنجینہ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

اس حصے کے شعری متن کی تفصیل اس طرح ہے:

اصناف	تعداد	اشعار
قصائد	۳	۱۴۴
غزلیات	۲۶۸	۱۵۰۱
رباعیات	۲	۱۲
		۱۶۵۷

غزلیات کی ردیف وار تفصیل:۔

ردیف	غزلیات	اشعار	غزل تا غزل
الف	۵۵	۲۹۰	۱......۵۵
ب	۲	۱۳	۵۶......۵۷
ت	۳	۱۸	۵۸......۶۰
ث	۲	۱۳	۶۱......۶۲
ج	۲	۱۲	۶۳......۶۴
چ	۳	۱۷	۶۵......۶۷
ح	۱	۵	۶۸............
د	۵	۳۲	۶۹......۷۳

ر	۷	۳۴	۷۴......۸۰
ز	۸	۳۶	۸۱......۸۸
س	۴	۱۷	۸۹......۹۲
ش	۲	۱۲	۹۳......۹۴
ع	۱	۵	۹۵............
غ	۲	۱۲	۹۶......۹۷
ف	۲	۱۲	۹۸......۹۹
ک	۳	۹	۱۰۰......۱۰۲
گ	۱	۷	۱۰۳............
ل	۶	۳۶	۱۰۴......۱۰۹
م	۵	۳۱	۱۱۰......۱۱۴
ن	۲۷	۱۶۵	۱۱۵......۱۴۱
و	۶	۴۴	۱۴۲......۱۴۷
ہ	۸	۵۳	۱۴۸......۱۵۵
ی	۱۱۳	۶۱۳	۱۵۶......۲۶۸
کل غزلیات=	۲۶۸	۱۵۰۱	

نوائے سروش:

یہ حصہ اس کلام پر مشتمل ہے جسے مرزا نے اپنی زندگی میں مصوا کر چھپایا اور یہی حصہ اس وقت دیوان غالب کے نام سے رائج و متداول ہے۔ اس کلام کا عنوان تجویز کرتے ہوئے مولانا عرشی کے پیش نظر غالب کا یہ مشہور شعر تھا:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

اس حصے کی شعری تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں:

ترتیب :	صفحہ تا صفحہ
دیباچہ فارسی	۱۲۰ ...... ۱۲۱
قطعات	۱۲۲ ...... ۱۲۹
مثنویات	۱۳۰ ...... ۱۳۱
قصائد	۱۳۲ ...... ۱۴۱
غزلیات	۱۴۲ ...... ۲۵۱
رباعیات	۲۵۲ ...... ۲۵۴
خاتمہ	۲۵۵ ...... ۲۵۸

اصناف	تعداد	اشعار
قطعات	۱۶	۱۱۵
مثنویات	۱	۳۳
قصائد	۴	۱۶۴
غزلیات	۲۳۴	۱۳۶۰
رباعیات	۱۶	۳۲

تفصیل غزلیات ردیف وار :

ردیف	غزلیات	اشعار	غزل تا غزل نمبر
الف	۴۸	۳۰۶	۱ ...... ۴۸
ب	۱	۱۳	۴۹ ......
ت	۴	۱۹	۵۰ ...... ۵۳
ج	۲	۴	۵۴ ...... ۵۵

ج	١	٦	٥٦ ....
د	١	٩	٥٧ ....
ر	٩	٦٩	٥٨ ...... ٦٦
ز	٥	٢٢	٦٧ ...... ٧١
س	١	٧	٧٢ ....
ش	١	٢	٧٣ ....
ع	٢	٨	٧٤ ...... ٧٥
ف	١	٢	٧٦ ....
ک	٢	١٥	٧٧ ....
گ	١	٢	٧٩ ....
ل	١	٩	٨٠ ....
م	٣	٨	٨١ ...... ٨٣
ن	٣٣	٢٢٥	٨٤ ...... ١٢٦
و	١١	٨١	١١٧ ...... ١٢٧
ہ	٢	٣	١٢٨ ...... ١٢٩
ی	١٠٥	٦٥٠	١٣٠ ...... ٢٣٤
میزان :	٢٣٤	١٣٦٠	

یادگارِ نالہ :

دیوانِ غالب مرتبہ عرشی کا تیسرا حصہ "یادگارِ نالہ" کے عنوان سے ہے۔اس حصے کا عنوان تجویز کرتے ہوئے سابقہ دونوں حصوں کی طرح، غالب کے اس شعر کو بنیاد بنایا گیا ہے کہ :

نالۂ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل بباد
یادگارِ نالہ، ایک دیوانِ بے شیرازہ تھا

اس جزو کی مذکورہ شعر کے حوالے سے یہ توضیح کی گئی ہے کہ اس میں مرزا کا وہ تمام کلام یک جا کیا گیا ہے جو اب تک کسی دیوان میں نہیں چھپا تھا لیکن مختلف اوقات میں بعض نسخوں کے حاشیوں یا خاتمہ میں یا مرزا کے خطوط میں یا ان کے نام سے دوسری بیاضوں میں موجود تھا۔ اس حصہ میں وہ کلام بھی موجود ہے جو اخبارات اور رسائل کے ذریعے اہلِ ذوق تک پہنچتا رہا۔ چوں کہ یہ کلام ابھی تک منتشر ہی تھا اس لیے مولانا عرشی نے غالب کے شعر کے حوالے سے اس کی شیرازہ بندی کی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا فرماتے ہیں:

> ''چوں کہ حصہ زیرِ بحث میں ان کے اوراقِ لختِ دل کی شیرازہ بندی ہے۔ اس لیے اس حصے کو ''یادگارِ نالہ'' کہنے میں گویا میرزا صاحب کی تائید حاصل ہو جاتی ہے۔''[۲۳]

غالب کے اشعار کی شیرازہ بندی کرتے وقت مولانا نے وہ تمام اشعار شامل کر لیے جو ان کی نظر میں معتبر تھے اور اس وقت تک انھوں نے ان کو کلامِ غالب میں شامل کرنا قطعاً گوارا نہ کیا جب تک کہ کوئی سند نہ مل گئی۔ اس معیاری انتخاب پر مولانا عرشی کے معیارِ تحقیق کی داد دینا پڑتی ہے۔ اس حصہ کی تفصیل درج ذیل ہے:

ترتیب:

اصناف	صفحات تا صفحات
قطعات	۲۶۰ ...... ۲۶۵
مثنویات	۲۶۶ ...... ۲۷۶
قصائد	۲۷۷ ...... ۲۸۳
مرثیہ	۲۸۳ ...... ۲۸۶
سہرا	۲۸۷ ...... ۲۸۸
مخمس	۲۸۹ ...... ۲۹۲
غزلیات	۲۹۳ ...... ۳۱۲
رباعیات	۳۱۳ ...... ۳۱۴

اصناف	تعداد		اشعار
قطعات	۱۴		۷۷
مثنویات	۳		۱۸۰
قصائد	۴		۱۱۰
مرثیہ وسلام	۲		۳۰
سہرے	۳		۱۶
مخمس	۱	بند	۱۱
غزلیات	۶۱		۲۲۵ شعراور ۲ مصرعے
رباعیات	۵		۸ شعر ایک مصرعہ
	۳۲		۴۲۴

غزلیات ردیف وار ترتیب:۔

الف	۷	۱۴	
ب			
ر	۲	۲	
س	۱	۱	صرف ایک شعر درج ہے
ط	۱	۱	
غ	۱	۵	
ک	۲	۱۲	
ل	۱	۱	
ن	۱۰	۴۰	
و	۶	۴۴	

و	۲	۴۰	
ی	۳۲	۱۰۲	
	۶۱	۲۲۵	شعرے مصرعے

نسخۂ عرشی طبع اول کا متن کل ۴۱۳۲ اشعار اور ۹ مصرعوں پر مشتمل ہے۔

....

متن میں ترتیب اشعار کے وقت جن امور کا خیال رکھا گیا ہے ان کی وضاحت بھی دیباچہ میں کر دی گئی ہے۔ مولانا عرشی کے خیال میں اُن کے مرتبہ نسخے سے پہلے جتنی اشاعتیں بھی دیوانِ غالب کے سلسلے میں مکمل ہوئیں ان میں اصناف کی ترتیب سنتِ سلف کے خلاف چلی آرہی تھی۔ تمام مرتبین کے یہاں اصناف کی ترتیب اس طرح تھی کہ دیباچہ، غزلیات، قصائد، مثنوی، قطعات، رباعیات اور آخر میں تقریظ۔ لیکن مولانا نے اپنے مرتب کردہ دیوان میں کلام کی ترتیب کے سلسلے میں غالب کے اپنے انتخابِ غالب کو بنیاد بنا کر تمام اصناف کو غالب کے انداز سے ترتیب دیا ہے، جو اس طرح ہے۔

دیباچہ، قطعات، مثنویات، قصائد، غزلیات، رباعیات، تقریظ، اسی ترتیب پر تینوں حصوں کو مرتب کیا گیا ہے۔ اس طرح ترتیب کے وقت ہر جزو کے اصناف کو علاحدہ تاریخی ترتیب سے پیش کیا ہے۔ غزلوں کے سلسلے میں ہر ردیف کو بھی الگ الگ حصوں میں تقسیم کر کے تاریخی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے۔ مولانا کے مطابق نسخۂ بھوپالی میں غالب نے شعروں کا اضافہ کیا تھا۔ انھیں مذکورہ غزلوں سے الگ کر کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بجائے اپنی غزلوں کے ساتھ رکھا گیا لیکن ان میں امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے ایک ''پھول'' کا نشان بنا دیا۔ اشعار کی تاریخی اہمیت سے پیش کرنے کے بارے میں مولانا عرشی فرماتے ہیں:۔

''میری کوشش تو یہی رہی کہ دیوان کے تمام اشعار کی واقعی یا تقریبی تاریخ

نظم کا پتا چل جائے مگر عام حالات میں اکثر شعروں کا صرف تاریخی عہد متعین ہو سکا ہے۔ اس کام میں دیوانِ غالب کے ان نسخوں سے بھی مدد ملی ہے جو مختلف زبانوں میں لکھے گئے یا چھپ کر شائع ہوئے تھے اور تاریخوں، تذکروں، معاصر شاعروں کے دواوین اور قدیم و جدید اخباروں اور رسالوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔''۲۵

اختلاف نسخ کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ دیوانِ غالب کا متن بھی یکساں نہیں رہا ہے۔ عام طور پر کتابت کی غلطیوں کو درست نہیں کیا گیا۔ مولانا نے نسخۂ حمیدیہ سے لے کر انتخابِ غالب اُردو تک کے ہر مسودے کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی اس نسخہ میں غالبؔ کی آخری اصلاح پیش کی گئی ہے۔ اس نسخے کی تیاری میں جن نسخوں کا مولانا عرشؔی نے مطالعہ کیا ان کے نام درج ذیل ہیں۔ چناں چہ ان غیر مطبوعہ اور مطبوعہ نسخوں کی کیفیت و کمیت مولانا عرشؔی نے پوری طرح بیان کر دی ہے۔

(الف) دیوانِ غالب — قلمی نسخے

۱۔ نسخۂ بھوپال	اس کی علامت ق ہے۔	۱۲۳۷ھ=۱۸۲۱ع
۲۔ نسخۂ شیرانی	اس کی علامت قا ہے۔	۱۲۴۲ھ=۱۸۲۶ء
۳۔ گلِ رعنا	اس کی علامت گل ہے۔	۱۲۴۵ھ=۱۸۲۹ء
۴۔ نسخۂ رام پور	اس کی علامت قب ہے۔	۱۲۴۸ھ=۱۸۳۳ء
۵۔ نسخۂ لاہور	اس کی علامت قج ہے	۱۲۶۸ھ
۶۔ نسخۂ رام پور جدید	اس کی علامت قد ہے	۱۲۷۱ھ=۱۸۵۵ء

(ب) مطبوعہ نسخے

۱۔ پہلا ایڈیشن	اس کی علامت م۔	۱۲۵۸ھ=۱۸۴۱ء
۲۔ دوسرا ایڈیشن	اس کی علامت ما۔	۱۲۶۳ھ=۱۸۴۷ء

۳۔ تیسرا ایڈیشن ۔ اس کی علامت صبہ ہے ۱۲۷۸ھ=۱۸۶۱ء

۴۔ چوتھا ایڈیشن اس کی علامت ج ہے۔ ۱۲۸۰ھ=۱۸۶۲ء

۵۔ پانچواں ایڈیشن اس کی علامت مد ہے۔ ۱۲۸۳ھ=۱۸۶۳ء.

۶۔ نسخہ حمیدیہ اس کی علامت ح ہے ۱۳۴۷ھ=۱۹۲۸ء

۷۔ انتخاب غالبؔ اس کی علامت ح انتخاب ہے ۱۳۸۲ھ=۱۸۶۶ء

۸۔ لطیف ایڈیشن اس کی علامت لطیف ہے ۱۳۴۷ھ=۱۹۲۸ء

کلام کی تفہیم کے حوالہ سے اپنے خطوط اور مختلف تحریروں میں غالبؔ نے اپنے کلام کی جو شرح کی تھی اسے 'شرح غالبؔ' کے عنوان کے تحت اس دیوان کے آخر میں شامل کیا گیا ہے جس سے کلام کو پڑھنے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اسی پہ مولانا عرشی کا یہ مرتبہ دیوان مکمل ہوتا ہے۔ گویا غالبؔ شناسی کی روایت میں مولانا عرشی کا مرتب کردہ دیوانِ غالب سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادبی حلقوں کی طرف سے اس کارنامہ پر مولانا عرشی کی تحقیقی خدمات کا اعتراف ان کے غالب شناس ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے دیوان کے بجائے اسے کلیات تسلیم کیا ہے۔[۲۶]

....

دیوانِ غالب نسخۂ عرشی طبع دوم

مولانا عرشی کی وفات کے بعد انجمن ترقی ہند نے اس دیوان کی اشاعت کا اہتمام کیا تھا۔ چناں چہ پبلک پرنٹنگ پریس، رام پور سے ۱۹۸۲ء میں دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ جناب ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے 'ذخیرۂ غالبیات' میں اس کی ایک جھلک دیکھنا نصیب ہوئی۔ مولانا عرشی نے جب پہلی جلد مرتب کر کے شائقینِ ادب کے سپرد کی تھی تو چند ہی دنوں میں بازار میں یہ ایڈیشن ناپید ہو گیا تھا۔ سننے میں آیا کہ اسی طرح دوسری اشاعت کا بھی یہی حال ہوا تھا۔ انجمن کی طرف سے اس نسخہ میں جتنی محنت و کاوش کی گئی۔ جناب صابر حسین صابر سنبھلی اپنے خط میں اس ایڈیشن کے تعارف کے حوالہ سے لکھتے ہیں :

''اس ایڈیشن کی اشاعت میں کارکنانِ انجمن نے جس قدر غفلت، غیر ذمہ داری اور بددیانتی سے کام لیا ہے اس کی مثال اُردو دنیا میں مشکل سے ملے گی...... اس ایڈیشن کے کسی اندراج سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کی طباعت کب مکمل ہوئی۔ ہاں اول تا آخر کسی جگہ مولانا عرشی کے نام کے ساتھ مرحوم کا لاحقہ نہیں ہے۔ مولانا عرشی کے دیباچے کے آخر میں البتہ ۲۵ رمارچ ۱۹۷۱ء کا اندراج ہے۔ اس لیے اندازہ ہے کہ اسی سال اس کی طباعت کا کام مکمل ہوگیا ہوگا۔ لیکن تقریباً بارہ برس کے بعد دفتری حبس سے اس کو کھلی فضا نصیب ہوئی جہاں یہ شائقین کی آنکھوں کا سرمہ بن گیا۔''[۲۷]

جن خیالات کا اظہار محترمی صابر حسین صابر نے کیا ہے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں تو دیوان کا تیسرا ایڈیشن بھی شائع ہوسکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کارپردازانِ انجمن نے دیوان سے وہ صفحہ بھی خارج کردیا ہے جس پر کتابت و اشاعت اور قیمت کی تفصیل درج ہوتی ہے اور قیمت و سالِ اشاعت صحت نامے کے آخری حصے میں بچی ہوئی جگہ پر تحریر کیا ہے لیکن اس میں تعداد اشاعت کو بھی واضح نہیں کیا گیا۔ اسی طرح انجمن ترقی اُردو ہند نے ایک زیادتی اور کی کہ دیباچے میں صفحہ ۱۵۹، ۱۶۰ پر پانچ تصاویر کے شامل دیوان ہونے کا ذکر تو کردیا ہے لیکن ہندستانی کرنسی کے مطابق اس کی قیمت ۹۸ روپے ہونے کے باوجود ایک تصویر بھی اس میں شامل نہیں کی گئی۔ تصاویر کی اہمیت کے بارے میں جناب صابر لکھتے ہیں:

''ان میں سے ایک تصویر جو نسخہ بھوپال کے ایک ورق کی ہے اتنی اہم تھی کہ اس کے بغیر عرشی زادہ کے استدراک کے ایک حصے کو سمجھ پانا بھی ناممکن ہوگیا ہے۔''[۲۸]

دیوان کی طباعت دوم کے بارے میں انجمن کی خدمات کا ایک سرسری سا جائزہ لیا جاچکا ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شامل مواد کا بھی تھوڑا سا تعارف پیش کیا جائے۔ طبع دوم کے بارے یہ تمام معلومات صابر سنبھلی کی فراہم کردہ ہیں۔ جو حسب ذیل ہیں

ا۔ دیباچہ:

دیباچہ کی ترتیب تو طبع اول جیسی ہی ہے لیکن اس میں تہذیب اور اضافوں کا بہت خیال رکھا گیا ہے۔ اس لیے اس کی ضخامت بڑھ کر ۱۶۰ صفحے تک پہنچ گئی ہے۔

اشاعتِ اوّل کے بعد ایک قابلِ ذکر واقعہ یہ ہوا تھا کہ جناب مالک رام نے اپنے تبصرے میں مولانا عرشی سے کئی جگہ اختلاف کیا تھا۔ اس اشاعت میں چوں کہ مولانا عرشی کو کچھ اور نسخے بھی مل گئے تھے اس لیے انھوں نے مالک رام کے تبصروں کا جواب دیا۔ وہ بھی اس دیباچہ میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ یاد رہے کہ مولانا عرشی نے مالک رام کے اعتراضات کے جواب میں جو مضمون قلم بند کیا تھا وہ ''نقوش'' لاہور، نومبر ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا۔ یہی مضمون اس وقت شاملِ دیوان ہے۔ اس کے علاوہ جو نئے نسخے ملے ان کے کوائف بھی رونقِ دیباچہ بنے ہیں۔ دوسری اشاعت کے لیے جن نسخوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی فہرست درج ذیل ہے:

ا۔ دیوانِ غالب بخطِ غالب	نسخۂ عرشی زادہ (بخطِ غالب) مخطوطہ ۱۸۱۶ء۔
۲۔ انتخابِ غالب	مشمولہ دیوان مومن مخزونہ رضا لائبریری، رام پور، مخطوطہ ۱۸۳۶ء۔
۳۔ دیوانِ غالب	نسخۂ بدایون، مخطوطہ ۱۸۳۸ء۔
۴۔ دیوانِ غالب	نسخۂ وسینہ لائبریری، مخطوطہ ۱۸۴۵ء۔
۵۔ دیوانِ غالب	نسخۂ کریم الدین (نسخۂ کراچی)، مخطوطہ ۱۸۴۵ء۔
۶۔ دیوانِ غالب	نسخۂ حمیدیہ دوم (مرتبہ: پروفیسر حمید احمد خان) مطبوعہ لاہور ۱۹۶۹ء
۷۔ دیوانِ غالب	نسخۂ عرشی زادہ، ڈیلکس ایڈیشن، مطبوعہ ۱۹۶۹ء

دیباچہ میں فروگزاشتوں کو دور کرنے کے علاوہ کچھ اور اضافے بھی کر دیے گئے ہیں۔

متن طبع دوم:

طبع اوّل میں کلام کو تین حصوں یعنی گنجینۂ معنی، نوائے سروش اور یادگار نالہ کے عنوانات میں تقسیم کیا گیا تھا۔ لیکن طبع ثانی میں "بادآورد" کے نام سے ایک اور حصے کا اضافہ ہوا ہے۔ اس میں غالبؔ کا وہ کلام شامل ہے جو دیوانِ غالب نسخۂ عرشی زادہ کی بھارت میں اشاعت اور پاکستان میں نقوش لاہور کے بیاض غالبؔ نمبر کی اشاعت کے بعد منظرِ عام پر آیا۔ اس سے قبل ہم اس سے بے خبر تھے۔

گنجینہ معنی طبع اوّل میں دو اشعار کا مکرر اندراج ہو گیا تھا۔ اس ایڈیشن میں اس تکرار کو بھی ختم کر دیا گیا ہے۔ اب اس دیوان کے حصہ اوّل کی صورت کچھ یوں ہے:

اصناف	تعداد	اشعار
قصائد	۳	۱۴۳
غزلیات	۲۷۸	۱۵۰۲
رباعیات	۶	۱۲
کل تعداد اشعار		۱۶۵۷

نوائے سروش:

۱۔	قطعات	۱۶، ۱۱۵
۲۔	مثنوی	۱، ۳۳
۳۔	قصائد	۴، ۱۶۲
۴۔	غزلیات	۲۳۴، ۱۳۶۰
۵۔	رباعیات	۱۶، ۳۲
	کل تعداد اشعار	۱۸۰۲

یادگار نالہ:

دوسرے ایڈیشن کے متن میں زیادہ تر تبدیلیاں اس حصہ میں ہوئی ہیں۔ ایک غزل ۳۰۲ غزل نمبر ۳۲، جس کا مطلع تھا:

پیران سال غالبؔ میکش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

سے اور عبدالباری آسی کے حوالے سے جو کلام درج ہوا تھا اس کو خارج کر دیا ہے۔ اس سے اس حصہ کا حجم بڑھنے کے بجائے کم ہو گیا ہے۔ اسی طرح صحت نامے میں عرشی زادہ نے غزل نمبر ۳۳ کو الحاقی مان کر خارج کرنے کی تاکید کی ہے۔ اس میں اضافہ کی کیفیت یہ ہے۔

۱۔	قطعات	۱۳	۷۵	
۲۔	مثنویات	۲	۱۶۸	
۳۔	قصائد	۴	۱۱۰	
۴۔	مرثیہ	۱	۳	بند
۵۔	سلام	۱	۲۱	
۶۔	سہرا	۳	۱۸	
۷۔	مخمس	۱	۱۱	بند
۸۔	غزلیات	۶۷	۱۴۰	شعر اور ۹ مصرعے
۹۔	رباعیات	۹	۱۶	شعر اور ایک مصرع
	کل تعداد اشعار	۵۹۶ شعر ۱۱ مصرعے		

بادآورد:

یہ وہ حصہ ہے جس کا اس ایڈیشن میں اضافہ ہوا ہے۔ متن کی صورت حال کچھ

یوں ہے:

غزلیات	۴۷	۱۶۴
رباعیات	۲	۴
کل اشعار		۱۶۵۷

طبع ثانی: کل میزان: ۲۲۲۴ شعر اور ۱۱ مصرعے۔

....

حواشی

۱۔ خط بنام حاتم علی بیگ مہر خطوط غالب، ص ۱۸۸، طبع پنجم ۱۹۸۲ء، مرتبہ: مہر۔

۲۔ بحوالہ: اشاریہ غالبؔ، مرتبہ: سیّد معین الرحمٰن، ص ۷۷۔

۳۔ ایضاً، ص ۷۸۔

۴۔ بحوالہ: اشاریہ غالب، ص ۷۹۔

۵۔ بحوالہ: غالب کی نادر تحریریں: خلیق انجم، ص ۱۵۰۔

۶۔ غالبؔ، از: مہر، ص ۳۹۰۔۳۹۱، طبع چہارم: مطبع عالم گیر الیکٹرک پریس، لاہور۔

۷۔ بحوالہ، اشاریہ غالب، ص ۸۰۔

۸۔ بحوالہ اشاریہ غالب: ص ۸۱۔

۹۔ ایضاً، ص ۸۳۔

۱۰۔ ڈاکٹر وحید قریشی، نذر غالبؔ، ص ۳۱۔

۱۱۔ بحوالہ: رسالہ العلم، کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۵۵۲، ۵۵۳۔

۱۲۔ بحوالہ: رسالہ ''العلم'' کراچی، ص ۵۵۴۔

۱۳۔ بحوالہ دیباچہ: دیوانِ غالب نسخۂ عرشی: ۱:۷۔

۱۴۔ رسالہ ''العلم'' کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۵۵۵۔

۱۵۔ بحوالہ رسالہ ''العلم'' کراچی، ص ۵۶۲، جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء۔

۱۶۔ ایضاً۔

۱۷۔ دیباچہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، ص ۲۷، طبع اوّل۔

۱۸۔ "تقریب" دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی، ص ۷، طبع اوّل۔

۱۹۔ دیباچہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، ص ۱۵، طبع اول۔ ۱۹۵۸ء۔

۲۰۔ بحوالہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی" دیباچہ، ص ۳۵، طبع اوّل، ۱۹۵۸ء۔

۲۱۔ دیباچہ نسخۂ عرشی، ص ۳۷، طبع اوّل۔

۲۲۔ بحوالہ ایضاً۔

۲۳۔ دیباچہ، ص ۲۷۔

۲۴۔ دیباچہ نسخۂ عرشی، طبع اول، ص ۲۷۔

۲۵۔ دیباچہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، ص ۲۷، طبع اوّل، ۱۹۵۸ء۔

۲۶۔ بحوالہ غالب از: مہر، طبع چہارم۔

۲۷۔ بحوالہ مکتوب صابر حسین صابر سنبھلی، صدر شعبہ اُردو ایم۔ ایچ۔ کالج مراد آباد، بنام راقم الحروف مورخہ ۱۹۸۳۔ ۹۔ ۲۳۔

۲۸۔ ایضاً۔

◆◆◆

چھٹا باب

متفرقاتِ عرشؔی بسلسلہ غالبؔ

◆◆

تحقیقِ غالب اور غالب شناسی کی روایت کے ارتقاء میں تصانیف و تالیفات کے علاوہ مولانا عرشؔی کے مضامین و مقالات بھی اساسی ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔ باب سوم میں ان متفرق مضامین کی فہرست دی جاچکی ہے۔ جن کا اب تک سراغ مل سکا ہے۔ تاہم بعض ایسے مضامین ہیں جو زیورِ طباعت سے آراستہ ہی نہیں ہوسکے۔ مولانا کے تمام مضامین ومقالات کی دریافت اور ان کا تجزیاتی مطالعہ بجائے خود تحقیقی موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ سعی و کاوش سے حاصل شدہ مضامین کا سنین وار تعارف پیشِ خدمت ہے۔ ان مضامین کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔

ا۔ خمارِ رسوم وقیود:

ان دریافت شدہ مضامین میں مولانا عرشؔی کا یہ پہلا طبع زاد مضمون ہے۔ اس کا تعارف اس مقالہ کے پہلے باب میں آچکا ہے۔ اس سے مولانا کی علمی و اَدبی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ یہ مضمون ماہ نامہ ''نیرنگ'' رام پور سے جولائی ۱۹۲۶ء جلد ۲ شمارہ ۷ میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کی ایک نقل عرشی زادہ کی وساطت سے موصول ہوئی ہے۔

یہ مضمون غالبؔ کے مشہور شعر ؎

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

کی تشریح پر مشتمل ہے۔ اس سے مولانا کی ابتدائی علمی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا نے

شعر کی تشریح کرتے ہوئے اعلا شاعری کے پس منظر کا جائزہ لیا ہے۔ نیز ان کی صلاحیتوں کے حامل افراد کی خصوصیات بھی پیش کی ہیں۔ ایک شعر کی تشریح تقریباً تین طویل صفحات پر محیط ہے۔ شاعری کے افادی پہلو پر بحث کرتے ہوئے مولانا عرشی لکھتے ہیں :

''ایک اچھا شاعر جس طرح ایک طرف ہماری معاشرت وتمدن سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ اسی طرح دوسری طرف ہمارے اجتماع میں جہاں جہاں نقص دیکھتا ہے، ٹوکتا جاتا ہے۔ اور اصلاح کیے بغیر نہیں رہتا اور حقیقتاً یہی ایک معیار ہے جس سے مفید اور ناکارہ شاعری کے حدود جدا کیے جاسکتے ہیں۔''[۱]

شاعری کا معیار متعین کرنے کے بعد مولانا کے نزدیک اس معیار پر پورا اُترنے والا شاعر غالبؔ ہے چناں چہ فرماتے ہیں:

''ہندستان کے شعرا میں جو ذات اس معیار شاعری پر پوری اترتی ہے...... وہ اسد اللہ خان غالبؔ کی ذات ہے۔ وہ اس وقت بزم ہند میں سازِ شعر پر زمزمہ سنج حقیقت ہوا کہ ابھی اور شعرا حقیقت کے نام سے بھی بہ مشکل آشنا تھے۔''[۲]

۲۔ نسخہ حمیدیہ کی فروگزاشتیں (نسخہ بھوپال کی روشنی میں)

یہ مضمون پہلی مرتبہ ''دیوانِ غالب (نسخہ حمیدیہ) کے چند اغلاط'' کے عنوان سے ''مجلہ عثمانیہ'' حیدر آباد (جلد ۲۵، شمارہ ۲، ص ۷ تا ۱۳) میں ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔ بعد ازاں یہی مضمون، نسخہ حمیدیہ کی فروگزاشتیں، نسخہ بھوپال کی روشنی میں، کے عنوان سے ہندستان سے رسالہ ماہ نامہ ''نیا دور'' لکھنؤ (بابت مئی ۱۹۶۹ء جلد ۲۵ شمارہ ۲، صفحات ۳ تا ۱۳) میں اور پاکستان سے رسالہ سہ ماہی ''صحیفہ'' لاہور کے غالبؔ نمبر سوم بابت جولائی ۱۹۶۹ء (جلد ۱۲ شمارہ ۴۸، صفحات ۱ تا ۲۸) میں بھی چھپا۔ رسالہ صحیفہ میں ۲۸ صفحات پر شائع ہونے والے اس مضمون کا ہر صفحہ اوسطاً ۲۵ تا ۲۸ سطروں پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں جیسا کہ عنوان ہی سے ظاہر ہے ''نسخہ حمیدیہ'' کی اغلاط کی نشان دہی کی گئی ہے۔ شروع میں مولانا

نے ریاست بھوپال سے شائع ہونے والے نسخۂ بھوپال، کو پیش کرنے پر اس ریاست کی تعریف کی ہے۔ فرماتے ہیں:

> "ریاست بھوپال مستحق تبریک ہے کہ اس نے مفتی انوار الحق صاحب ایم۔ اے مرحوم خلف مولانا عبداللہ صاحب ٹونکی (مرحوم) کو اس کی ترتیب کا ذمہ دار قرار دیا۔"[۳]

اس مضمون کو لکھنے کی ضرورت اس وقت پیش ہوئی جب ۱۹۴۴ء میں مولانا عرشی ناگ پور میں منعقدہ انجمن ترقی اُردو، کے اجلاس میں شرکت کے بعد واپسی میں بھوپال ٹھہرے، اور انھوں نے نسخۂ حمیدیہ کے اصل نسخہ کی زیارت کی چناں چہ اصل اور نقل میں جو فرق محسوس کیا اسے نوٹ کرتے گئے۔ مولانا اس کی اہمیت کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

> "نسخۂ بھوپال کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے ان یادداشتوں کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اس لیے علاحدہ مضمون کی شکل میں یک جا کرنا مناسب جانتا ہوں۔ تاکہ وہ حضرات جن کے پاس نسخۂ حمیدیہ ہے، اپنے اپنے نسخوں میں تصحیح و اضافہ کر سکیں۔"[۴]

اس وضاحت کے بعد مولانا نے نسخۂ بھوپال کی کیفیت و کمیت بیان کی ہے۔ یہ یاد رہے کہ یہی مواد نسخۂ عرشی طبع اول میں شائع ہو چکا تھا۔ اصلاح کرتے وقت مولانا نے ہر صفحہ کا الگ نمبر درج کر کے اس میں قابلِ اصلاح شعر کو لکھا ہے اور اس کے بعد نسخۂ بھوپالی میں جس طرح سے اس شعر کو بیان کیا گیا ہے وہ بعد میں تحریر کر دیا ہے۔ اس لیے ان دونوں نسخوں کا تقابل آسان ہو گیا ہے۔ اصلاح کے دوران ایک اہم پہلو جس کی طرف مولانا نے توجہ دلائی وہ یہ ہے کہ نسخۂ بھوپال میں املا کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان کے خیال میں کلام میں اصلاح خود میرزا صاحب کے ہاتھ سے ہونا چاہیے تھی۔ لیکن جب املا کی غلطیوں کو دیکھیں تو شک ہوتا ہے کہ بدنما خط کے اندراجات غالبؔ کے ہاتھ سے نہیں ہو سکتے مثلاً لکھتے ہیں:

"بدنما خط میں جو اضافے یا اصلاحیں ہیں ان میں املے کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں مثلاً "خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں"؟
میں "بھاگے گے"۔ یا "آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی" میں "غفلت" لکھ دیا ہے۔

"اس قسم کی غلطیاں غالب جیسے شخص سے ۲۵ سال کی عمر میں سخت حیرت انگیز ہیں۔ اس لیے اس کے باوجود کہ عام طور پر اس انداز کا حک و اضافہ بالعموم بخط مصنف ہوا کرتا ہے اور اندرون کلام میں قلم زدگی و اصلاح خود میرزا صاحب کے قلم سے ہونا چاہیے، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بدنما خط کے اندراجات بخط غالب نہیں۔"[۵]

نسخۂ بھوپال کی تعریف و توضیح کے بعد مولانا نے ص ایک سے لے کر ص ۲۸۶ تک نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ بھوپال کی فروگزاشتوں کو پیش کیا ہے۔ ان فروگزاشتوں کو پیش کرنے کے بعد آخر میں وہ ان اصلاحوں کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر نسخۂ بھوپال کا تفصیلی مطالعہ ممکن ہوتا تو نسخۂ حمیدیہ کی نئی ترتیب اور تصحیح میں کس قدر مدد ملتی۔ اور نسخۂ بھوپال کے ضائع ہو جانے سے کیسا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔"[۶]

۳۔ غالب کا دربار اور خلعت:

یہ مضمون بھی کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ اول اول یہ ہفتہ وار "دورِ جدید" دلی کے "اردو نمبر" بابت ۲۵ اگست ۱۹۵۷ء میں صفحہ ۷۱ تا ۷۴ پر شائع ہوا۔ اس کے بعد ہندستان ہی سے ماہ نامہ "شاعر" بمبئی بابت فروری/ مارچ ۱۹۶۹ء (جلد ۴۰، شمارہ ۲، ۳، صفحات ۲۱۳ تا ۲۱۷) میں چھپا، پاکستان سے اس کی اشاعت کا سہرا کراچی سے چھپنے والے ماہ نامہ "ماہ نو" (بابت جنوری/ فروری ۱۹۶۹ء جلد ۲۲، شمارہ ۱، ۲، صفحات ۲۸۰ تا ۲۸۳ اور ۲۸۸) کے سر ہے۔

اس مضمون میں مولانا عرشی نے غالب کے سوانحی حالات میں سرکار انگریز کے ساتھ اس کے تعلقات کو موضوع بنایا ہے۔ حکومت انگلشیہ کے ساتھ مرزا کے روابط پر سیر

حاصل تبصرہ مولانا نے مکاتیب غالب، کے دیباچہ میں بھی کیا تھا۔ غالب کے اپنے خطوط کے حوالے سے اس مضمون میں ان تعلقات کو موضوع بنایا گیا ہے کہ انگریزوں کے برسر اقتدار آنے کے ساتھ ساتھ ان کی انتظامی پالیسی یہ رہی کہ امرا اور روسا یا صاحب حیثیت اور ان کے طرف دار حضرات کو نوازتے رہنا چاہیے۔ چناں چہ اس بنا پر غالب کو بھی دربار انگلشیہ میں ہمیشہ عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔ اس طرح وقتاً فوقتاً جب بھی دربار ہوتا تو انھیں بلایا جاتا اور خلعت عطا کیا جاتا۔ تاہم ۱۸۵۷ء میں ہنگامہ غدر میں مرزا کی پنشن اور خلعت دونوں بند کر دیے گئے۔ پنشن تو مئی ۱۸۶۰ء میں بحال کر دی گئی لیکن دربار میں باریابی اور خلعت سے محرومی کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ اس بدنصیبی نے مرزا کو بہت پریشان کیے رکھا اور وہ خلعت و دربار کی بحالی کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔

برسر اقتدار حکومت کا موقف تھا چوں کہ مرزا غدر میں باغیوں کی خوشامد کرتے رہے ہیں۔ اس لیے حکومت ان سے ملنا پسند نہیں کرتی۔ گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے مرزا کی پنشن اور خلعت بند کر دی تھی۔ ان کے بعد جب ۱۸۶۲ء میں لارڈ الگن گورنر جنرل ہوئے تو مرزا نے کہا کہ وہ بے گناہ ہیں۔ اس لیے خلعت بحال کیا جانا چاہیے۔ چناں چہ مرزا کی درخواست پر غور کرنے کے بعد رابرٹ منٹگمری لیفٹننٹ گورنر بہادر نے ۳/ مارچ ۱۸۶۳ء کو منعقدہ دربار دہلی میں مرزا کا خلعت بحال کرنے کی اجازت دے دی۔ اس ضمن میں مولانا عرشی نے مذکورہ مضمون میں غالب کے ایک خط کا متن بھی پیش کیا ہے:

> "میں نے کہا سبحان اللہ! کارساز ما بفکر کار ما۔ ۳۔ مارچ کو ۱۲ بجے نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر نے مجھ کو بلایا۔ خلعت عطا فرمایا اور ارشاد ہوا کہ لارڈ صاحب کے یہاں کا دربار اور خلعت پاؤ گے۔ عرض کیا گیا، حضور کے قدم دیکھے، خلعت پایا، لارڈ صاحب بہادر کا حکم سن لیا بیان ہو گیا۔"[۷]

مولانا عرشی کا بیان ہے کہ دربار اور خلعت کی بحالی کے لیے غالب کی بیان کردہ تاریخیں متنازعہ فیہ ہیں۔ اس لیے سوانح نگار حتمی تاریخ کا تعین نہیں کر پاتے۔ مولانا عرشی نے اس مضمون کے آخر میں غالب کی اس درخواست کا بھی ذکر کیا ہے جو انھوں نے لارڈ

لارنس کے زمانے میں ملکہ معظمہ کا درباری شاعر بننے کے لیے دی تھی۔ چوں کہ مرزا لارڈ موصوف کے مداح رہ چکے تھے۔ اس لیے ان کی سفارش پر ازسر نو مرزا کے تعلقات پر غور کیا گیا۔ اس طرح مرزا کی دستنبو کو سرکاری خرچ پر شائع کرنے کا بھی مسئلہ پیدا ہوا تو سرکاری رپورٹ کے حوالے سے بتایا کہ دستنبو قدیم زبان فارسی کی تصنیف ہے۔ اس لیے سرکاری خرچ پر شائع نہیں ہو سکتی۔ ان وجوہات کی بنا پر انھیں درباری شاعر بننے کی سعادت نصیب نہ ہو سکی۔ البتہ خلعت اور دربار میں آمد بحال کر دی گئی۔ اس بحث کے بعد مولانا عرشی لکھتے ہیں:

> "آخر تمام اُمور پر غور کرنے کے بعد حکومت نے ۶ رجنوری ۱۸۶۶ء کو یہ فیصلہ کیا کہ مرزا صاحب کو درباری شاعر بنانا مناسب نہیں۔ البتہ گورنر جنرل کو اس میں کوئی اعتراض نہ ہوگا، اگر لیفٹنٹ گورنر پنجاب انھیں خلعت عطا کریں یا انھیں دربار میں پہلے سے اُونچی جگہ عطا کی جائے۔ اس حکم پر گورنر پنجاب نے انھیں خلعت عطا کی تو قربان علی بیگ سالک نے حسب ذیل قصیدہ لکھا۔ (دیوانِ سالک: ۲۷۱)

اسد اللہ خان بہادر را رہبری کرد بخت و اقبالش
داد خلعت گورنر پنجاب مہربانی نمود بر حالش

عیسوی گفتم از سر عزت
خلعت ہفت پارچہ سالش

۱۷۹۶ء ۱۸۶۶ء ۸

۴۔ غالب کی چند نئی اُردو تحریریں:

مندرجہ بالا مضمون ماہ نامہ "شاعر" بمبئی کے (خاص نمبر) بابت مارچ / اپریل ۱۹۵۹ء (جلد ۳، شمارہ ۳، ۴، صفحہ ۳۳ تا صفحہ ۳۶) میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں یہی مضمون اسی عنوان کے تحت رسالہ سہ ماہی "اُردو" شمارہ ۱، ۱۹۷۹ء میں صفحہ ۵ تا ۱۰ پر بھی شائع ہوا ہے۔

اس مضمون میں مولانا عرشی نے مرزا غالب کی چند نا پید اُردو تحریروں کی نشان دہی کی ہے۔ یہ تحریریں تنقیدی اور اَدبی نوعیت کی ہیں۔ چناں چہ مولانا لکھتے ہیں:

"عام طور پر یہ خیال ہے کہ مرزا غالب نے صرف برہانِ قاطع پر تنقیدی نوٹ لکھے تھے جو برہان کے نام سے پہلے اور بعد ازاں درفش کاویانی لقب پا کر شائع ہوئے، لیکن لوہارو کلیکشن (رضا لائبریری) میں چند ایسی مطبوعہ کتابیں ہیں جن پر ان کے قلم کے ریمارک ہیں۔ آج کی صحبت میں ان میں سے چند اُردو تحریریں پیش کرتا ہوں۔"۹

اس وضاحت کے بعد مولانا نے لوہارو کلیکشن (رضا لائبریری) میں موجود خان آرزو کی کتاب موہبت عظمی جو دہلی کے مطبع شرف المطابع میں ۱۸۵۳ء میں چھپی اس پر مرزا کے ریمارک الگ الگ صفحوں کے نمبر درج کر کے بیان کیے ہیں۔ یہ تصنیف تو فارسی کی ہے۔ مگر غالب نے بعض اشعار پر اعتراض کرتے ہوئے اُردو میں اظہار خیال کیا ہے۔ اس مضمون میں موجود ایک مثال تبرکاً پیش ہے۔ خان آرزو نے اپنے ایک فارسی شعر پر ظہیر الدین فاریابی کی سند پیش کی۔ چناں چہ غالب خان آرزو کے شعر اور سند پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پہلے اپنا عقیدہ ظاہر کرتا ہوں، عرفی اور نظیری کا ثالث نہ کبھی تھا اور نہ کبھی ہوں گا۔ قدما کی طرز اور ہے۔ کلام نازک خیالوں میں ہے جو فغانی کی روش کے پیرو ہیں۔ ان میں دونوں کے برابر کوئی نہیں۔ بایں ہمہ یہ بزرگوار اپنے کلام پر نظر ثانی نہیں کرتے۔ اگر مولانا (خان آرزو) اس شعر کو کہہ کر دوبارہ دیکھتے تو ثروت کی جگہ بہمت شعر درج ہے:

جاوید ہمی بخشد و از مایہ نکاہد
رشح قلمت ثروت اصناف الم را

لفظ مفید مطلب پیدا ہو جاتے، اور یہ کھٹک اضافت اور اضافت کی تاویلات کا قصہ جاتا رہتا۔

جاوید ہمی بخشد و از مایہ نگاہد
رشحِ قلمت فائدہ اصناف الم را

رشحِ قلمت کام دل اصناف الم را

غالبؔ ،انصاف کا طالب''[۱۰۰]

کتاب کے مختلف صفحات سے مثالیں پیش کرنے کے بعد مولانا کا کہنا ہے کہ:

''ان سب تحریروں سے میرزا صاحب کی سخن رسی اور دیدہ وری ظاہر ہوتی ہے۔ نیز یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ ہی برہانِ قاطع پر نہیں برسے ہیں۔ اس میں ترتیبی اور تشریحی اسقام کی بہتات اتنی تھی کہ انھیں ڈر تھا کہ اگر اس کی غلطیوں کو اجاگر نہیں کر دیا گیا تو مبتدی ہی نہیں اکثر اہلِ علم بھی بہک جائیں گے۔''[۱۰۱]

۵۔ دیوان غالب اردو کا ایک نادر مخطوطہ:

اس مضمون کو مختلف اوقات میں ملک کے نامور جرائد میں جس طرح چھپنے کا موقع ملا ہے ان رسائل کی تفصیل اس طرح ہے۔ پاکستان میں غالباً اس کی پہلی اشاعت ماہ نامہ ''نقوش'' لاہور بابت جون ۱۹۶۰ء ص ۵ تا ۱۱ ہوئی۔ اس سال یہ مضمون ماہ نامہ ''ذوالقرنین'' بدایون سے ۲۱ جولائی کے شمارے میں چھپا۔ اس کے بعد دہلی سے شائع ہونے والے ماہ نامہ ''تحریک'' کے شمارے بابت اپریل/مئی ۱۹۶۱ء جلد ۹ شمارہ ۱، ۲، صفحہ ۹ تا صفحہ ۲۹ میں چھپا۔ اسی طرح اس کی ایک اشاعت لکھنؤ کے ماہ نامہ ''نیا دور'' بابت جنوری ۱۹۷۱ء، جلد ۲۶، شمارہ ۱۱، ص ۳ تا ۶ بہ عنوان (دیوانِ غالبؔ نسخہ بدایوں ایک مخطوطہ) ہوئی۔ یہ مضمون دیوانِ غالبؔ نسخہ عرشی کی طبع ثانی میں صفحہ ۱۰۶ تا ۱۱۱ پر موجود ہے۔

اس مضمون میں مولانا عرشی نے دیوان غالب کے ایک نئے دریافت شدہ نسخہ کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ دیوانِ غالب نسخہ عرشی کی طباعت کے بعد وہ سمجھنے لگے تھے کہ کسی نئے نسخہ کا منظرِ عام پر آ جانا مشکل ہے۔ لیکن اسی دوران میں مطبع نظامی بدایوں

کے مالک جناب رحیم الدین نظامی سے انھیں ایک نادر مخطوطہ کی خبر ملی۔ یہی وہ مخطوطہ ہے جس کے تعارف کو اس مضمون میں مولانا نے پیش کیا ہے۔ اسی ''قلمی نسخے'' پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دیوانِ غالب کا یہ نسخہ جسے میں آئندہ نسخہ بدایوں کے نام سے پکاروں گا۔۱/۴۔۱/۲×۸۔۱/۵ ناپ کا ہے۔ روشنائی کالی، عنوان اور جدول شنجرفی اور باریک لاجوری ہے۔ کاغذ بانس کا دیسی بنا ہوا ہے۔ ہر ورق میں رکاب بھی ہے اور ورق داغ بھی۔ خط شکستہ آمیز نستعلیق ہے۔ معمولی کرم خوردگی بھی پائی جاتی ہے۔ جلد پرانی مگر عام حالت اچھی ہے۔ سرورق پر مہر ہے جس میں ''محمد ذوالفقار الدین ۱۲۵۲ھ کندہ ہے۔''[۱۲]

مذکورہ دریافت شدہ نسخہ کے تعارف کے علاوہ مولانا عرشی نے اس کی ردیف وار غزلوں کی تعداد بھی بیان کی ہے۔ اس نسخہ میں متن میں موجود اشعار کی تعداد اس طرح سے ہے:

غزلیات	=	۹۷۸
قصائد	=	۶۰
قطعات	=	۱۳
رباعیات	=	۱۶
میزان	=	۱۰۶۷ [۱۳]

لیکن مولانا عرشی کی وضاحت کے مطابق متن کے علاوہ حاشیوں پر بھی لکھے ہوئے اشعار موجود ہیں، جن کی تعداد ہے:

غزلیات ردیف الف	:	۴
غزلیات ردیف ن	:	۴
غزلیات ردیف و	:	۹
غزلیات ردیف ی	:	۹

قصائد ۱، قطعات ۲، رباعیات ۴، میزان = ۳۳۔

دونوں حصوں کے کل اشعار کی تعداد ۱۱۰۰ ہے۔[۱۴]

مولانا کے مطابق اس نسخہ میں نواب ضیاء الدین خان نیر رخشاں کی لکھی ہوئی تقریظ بھی شامل ہے جو انھوں نے ۱۲۵۴ھ مطابق مارچ ۱۸۳۸ء اور مارچ ۱۸۳۹ء کے درمیان لکھی تھی۔ نسخہ میں موجود کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دیوان اسی سال مرتب ہوا ہے۔ اس کے بعد اس مخطوطہ کی بعض خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے دواوین کے مقابلہ میں اس کی انفرادیت اس اعتبار سے ہے کہ اس میں دو ایسے اشعار موجود ہیں جو کسی دوسرے مطبوعہ ایڈیشن میں شامل نہیں ہیں۔ آخر میں مولانا عرشی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ نسخہ غالب پر کام کرنے والوں کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

۶۔ غالب کا معیار شعر و سخن: (اقتباسات از دیوان غالب نسخۂ عرشی)

یہ مضمون ماہ نامہ ''نگار'' (غالب نمبر) لکھنؤ بابت جنوری ۱۹۶۱ء میں جلد ۴۰، شمارہ ۱ صفحہ ۸۹ تا صفحہ ۱۰۱ میں شائع ہوا۔ اس کے بعد پاکستان سے ماہ نامہ ''نگار'' کراچی پاکستان کے شمارے جنوری/فروری ۱۹۶۹ء غالب نمبر شمارہ ۱، ۲ صفحہ ۱۷ تا ۲۹ میں چھپا۔

یہ مضمون دراصل مولانا عرشی کے مرتبہ دیوان غالب سے ماخوذ ہے۔ مولانا نے مرزا کی شعر گوئی پر تفصیلی بحث کی تھی۔ نیز غالب کے نظریہ شعری پر بھی مرزا کی اپنی تحریروں کے حوالے سے تبصرہ کیا تھا۔ ان امور سے متعلق گزشتہ باب میں بحث کی جا چکی ہے۔ اس مضمون میں جو ذیلی عنوانات ہیں وہ ہیں:۔ ۱۔ تتبع اساتذہ ۲۔ راہ سخن کے غول (جس میں مرزا نے ہندستان کے شعرا و ادبا پر تنقید کی ہے۔ اور انھیں قتیل اور غنیمت کا مقلد قرار دیا ہے۔ ۳۔ اصل الاصول، اس عنوان میں مرزا نے ہندستان کے شاعروں کو فارسی اساتذہ کی پیروی کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ اولاً مناسبت، طبیعت اور تتبع اہل کلام ضروری ہے۔ غالب کے نظریات کو ان کے خطوط کے حوالے سے واضح کیا گیا ہے۔ ۴۔ تتبع لہجہ: اس عنوان کے تحت مرزا کے لہجہ کے سلسلے میں خیالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مرزا ایرانیوں کے

لہجہ کی تقلید کو غلط تصور کرتے تھے۔ ان موضوعات کے بعد مرزا کی شعر گوئی میں ''آغاز شعر گوئی'' سے لے کر ''ریختہ گوئی'' کے ادوار کا تعین کیا ہے اور ہر دور کی خصوصیات بھی بیان کر دی ہیں۔ ''اوصاف شعر'' کے عنوان کے تحت اچھے شعر کے سلسلے میں مرزا کے نظریات کی وضاحت پیش کر دی ہے اور مثالیں ان کی تحریروں سے درج کی ہیں۔ بایں ہمہ ''عیوب شعری'' کے حوالے سے غالبؔ نے اشعار کی خرابی میں جو دلائل دیے انھیں پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ مرزا کی شاعری میں ''ہزل و ہجو'' کے بارے میں کہا ہے کہ وہ ہزل گوئی سے نفرت کرتے تھے۔ اس لیے ان کے یہاں یہ صنف نہیں ملتی۔ آخری عمر میں مرزا نے شعر گوئی ترک کر دی تھی۔ اس کے بعد باب کو مکمل کر دیا ہے۔

۷۔ نسخہ حمیدیہ اور بجنوری:

یہ مضمون اول ماہ نامہ ''نیا دور'' لکھنؤ بابت مئی ۱۹۶۱ء، جلد ۱۶، شمارہ ۲، صفحہ ۵ تا صفحہ ۸ پر شائع ہوا۔ پاکستان میں یہ مضمون رسالہ ''العلم'' کراچی بابت جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ ۵۴ تا ۵۳۵ میں شائع ہوا۔

اس مضمون میں غالبؔ کے مشہور نقاد و محقق عبدالرحمٰن بجنوری کے مقدمہ ''محاسن کلام غالبؔ'' اور نسخہ بھوپال کے درمیان ہم آہنگی کو موضوع بنایا ہے۔ اس کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ آیا بجنوری مرحوم نے جیتے جی نسخہ بھوپال کو دیکھا یا نہیں؟ یہ مضمون لکھنے کی ضرورت مولانا عرشیؔ کو اس وقت پیش آئی جب سیّد احتشام حسین کو نسخہ حمیدیہ پر اپنے دوست کی طرف سے جو خط ملا تھا اس عبارت کو دیکھا جس میں کہا گیا تھا کہ بجنوری نے مقدمہ متداول نسخہ حمیدیہ کے لیے اس وقت لکھا جب نسخہ بھوپال دریافت ہو چکا تھا۔ اور دستیاب ہونے پر وہ مکمل طور پر دیوان غالب شائع کرنا چاہتے تھے۔ مولانا عرشیؔ نے مولوی عبدالحق کے بیانات اور دیگر شہادتوں کے پیش نظر اس موقف کو رد کیا ہے۔ اس لیے کہ نسخہ حمیدیہ میں بعض اشعار ایسے ہیں جن پر بجنوری کا تبصرہ نہیں ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ بجنوری جیسا شخص تبصرہ لکھتے وقت نسخہ حمیدیہ کو پا گیا ہوتا۔

تو ناممکن تھا کہ وہ مرزا صاحب کے مخصوص الہامی فلک پیمائی پر زمین آسمان کے قلابے نہ ملا دیتا۔ لہٰذا قلم زد اشعار پر مقدمے میں ایک ادنیٰ سا اشارہ بھی نہ کرنا بتاتا ہے کہ وہ اس نسخے کی دستیابی سے پہلے اپنا تبصرہ مکمل کر چکے تھے۔"[۱۵]

ان خارجی حوالوں کے علاوہ مولانا عرشی داخلی حوالوں سے ثابت کرتے ہیں کہ غالب کا انتقال ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ہوا۔ ان کے انتقال کے پچاس برس بعد نسخہ بھوپال کا دریافت ہونا بتاتا ہے کہ یہ ۱۵ فروری ۱۹۱۹ء کے لگ بھگ ملا۔ پھر ایک صدی تک اخفا میں پڑا رہا اور یکم نومبر ۱۸۲۱ء کے سو برس بعد نومبر ۱۹۲۱ء کو منظرِ عام پر آیا۔ اس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

"ان دونوں تاریخوں کے تضاد کے باوجود یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ کم از کم فروری ۱۹۱۹ء سے پہلے دیوان نہیں ملا تھا۔ چوں کہ بجنوری مرحوم نے معارف نومبر ۱۹۱۸ء کے شذرات کے مطابق ۷ نومبر ۱۹۱۸ء کو بھوپال میں انتقال کیا تھا۔ اس لیے اس سے یہ بھی ترشح ہو گیا ہے کہ ان کے انتقال کے بعد یہ نسخہ ملا تھا۔"[۱۶]

مندرجہ بالا مثالوں کے علاوہ بھی مولانا عرشی نے شہادتیں پیش کی ہیں کہ بجنوری مرحوم کو یہ نسخہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

۸۔ دیوانِ غالب اُردو نسخہ عرشی:

اس مضمون کو پاکستان میں ماہ نامہ "نقوش" لاہور، نومبر ۱۹۶۴ء نے شائع کیا۔ اسی سال بمبئی سے "نوائے ادب" بابت اکتوبر ۱۹۶۴ء ص ۵ تا ۱۹ میں بھی چھپا۔ اس شمارے کی ایک نقل عرشی زادہ کی وساطت سے دستیاب ہوئی ہے۔

۱۹۵۸ء میں دیوان غالب نسخہ عرشی طبع ہو کر منظرِ عام پر آیا تو بعض نقادوں نے اس کا تجزیہ شروع کیا۔ چناں چہ مالک رام نے اس نسخہ میں بعض سقم کی نشان دہی کی اور مولانا عرشی سے بعض اُمور میں اختلاف کیا۔ مالک رام کے اعتراضات کو سامنے رکھ کر مولانا عرشی نے دوبارہ تحقیق کی اور ان کے اعتراضات کا جواب دیا۔ یہ مضمون ان ہی

جوابات کی صورت میں ہے۔ اس تعارف میں مکمل مضمون کا پیش کرنا ناممکن ہے۔ البتہ اعتراضات میں سے ایک آدھ کو بیان کر دینا کافی ہے۔ مالک رام جی نے اعتراض کیا تھا کہ متداول دیوان کی ترتیب و تہذیب دہلی یا کلکتہ میں ہوئی؟ پھر اس کا انتخاب ان کے خیال میں غالبؔ کے سفرِ کلکتہ قیامِ کلکتہ میں گلِ رعنا سے قبل عمل میں آیا ہے۔ اس کے جواب میں مولانا کا موقف ہے کہ گلِ رعنا پہلے مرتب ہوئی اور دیوان متداول کا انتخاب اس کے بعد عمل میں آیا۔ مثلاً:

"گلِ رعنا میں ایسے متعدد پرانے شعر پائے جاتے ہیں جو متداول دیوان میں نہیں ہیں۔ اگر گلِ رعنا کی بنیاد یہ دیوان ہوتا تو چاہیے تھا کہ معاملہ برعکس ہوتا۔"[۱۷]

۹۔ غالب کی نئی فارسی تحریریں:

یہ مضمون رسالہ "ماہِ نو" کراچی میں دو بار شائع ہوا۔ پہلے مارچ ۱۹۶۵ء، جلد ۱۸، شمارہ ۳، صفحہ ۶۵ تا ۷۳ اور بعد میں جنوری/فروری ۱۹۶۹ء کے شمارے میں صفحات ۲۳۳ تا ۲۴۲ میں بھی چھپا۔

مرزا کے سوانحی حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے قاطع برہان کے جھگڑے کو کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس مضمون میں مولانا نے اس کتاب سے حوالے پیش کیے ہیں جس سے یہ سارا جھگڑا شروع ہوا۔ مولانا کے مطابق مرزا کے مطالعہ میں قاطع برہان کا جو نسخہ پیشِ نظر رہا وہ افضال المطابع کلکتہ میں ۱۸۳۹ء میں محمد اعظم لکھنوی کے اہتمام سے بانس کے کاغذ پر نسخ ٹائپ میں ۹۳۴ صفحات پر مشتمل تھا۔ مولانا لکھتے ہیں:

"مرزا اس کتاب کو پڑھتے وقت اپنے اختلافی نوٹ جگہ جگہ حاشیوں پر لکھتے رہے تھے۔ کبھی اُردو میں اور زیادہ تر فارسی میں، یہ تحریریں سب کی سب قلم برداشتہ اور اس لیے آورد سے پاک ہیں۔ لیکن اس میں سنجیدگی بھی ہے، ظرافت بھی اور غیر ثقافت بھی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس موڈ میں ہوتے تھے ویسی ہی تحریر قلم سے نکلتی تھی۔"[۱۸]

اس کے بعد مولانا نے برہانِ قاطع اور مرزا کے حاشیوں کو ساتھ ساتھ رکھ کر پیش کیا ہے اور مرزا کی صلاحیتوں کی داد دیتے ہوئے مولانا نے برہان قاطع کے نسخۂ تہران کے مصحح کنندہ ڈاکٹر محمد معین کے بیان کی تصدیق بھی پیش کر دی ہے۔ جس سے غالبؔ کا موقف باوزن ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ غالبؔ کی چند نئی فارسی تحریریں:

یہ مضمون بھی گزشتہ مضمون کی طرح ''ماہِ نو'' کراچی میں دوبار شائع ہو چکا ہے۔ اس کی پہلی اشاعت فروری ۱۹۶۷ء کے شمارے نمبر ۲، جلد ۲، صفحہ ۹ تا ۱۲، ۱۳ تا ۲۰، ہوئی جب کہ دوسری مرتبہ جنوری/فروری ۱۹۶۹ء میں جلد ۲۲، شمارہ ۱، ۲، صفحہ ۲۴۳ تا ۲۵۵ میں چھپا۔

یہ مضمون بھی پہلے مضمون کا ضمیمہ تصور کیا جانا چاہیے اس میں برہانِ قاطع پر مرزا کے اعتراضات کی دوسری قسط پیش کی گئی ہے۔ اس میں ۳۷ اعتراضات یا تحریریں شامل ہیں اور ساتھ ساتھ تصدیق کے لیے فارسی شناس ڈاکٹر محمد معین کا بیان بھی پیش کرتے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

> ''میرے پیش نظر اسدی طوسی کی لغت فرس کے ساتھ برہانِ قاطع کا وہ نسخہ بھی رہا ہے جو تہران سے ڈاکٹر محمد معین کے حاشیوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ مناسب موقعوں پر میں ان دونوں کے حوالے دیتا گیا ہوں۔''[۱۹۰]

مولانا کے بیان کے مطابق یہ اعتراضات اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں غالبؔ نے زیر نظر مطالعہ کتاب میں لکھے تھے لیکن بعد میں از سر نو انھیں فارسی میں لکھا۔ یہی اعتراضات کتابی صورت میں قاطع برہان کے عنوان سے تالیف ہوئے۔ مولانا کے پیش کردہ ان اعتراضات کو غالبیات میں ایک اضافہ تصور کرنا چاہیے۔

۱۱۔ میرزا کا زائچہ:

یہ مضمون ۱۹۶۷ء میں دلی سے ماہ نامہ ''آج کل'' بابت فروری، جلد ۲۵ شمارہ ۷ میں صفحہ ۷ تا ۱۱ شائع ہوا۔ پھر پاکستان سے ماہ نامہ ''ماہِ نو'' کراچی بابت فروری ۱۹۶۹ء جلد

۲۲، شمارہ ۱۰، ۲، صفحہ ۴۳ تا ۴۷ میں چھپا۔ اس مضمون میں غالبؔ کے زائچہ یا جنم پتر پر نجوم کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ مرزا نے اپنے ایک قصیدے میں جوان کے **کلیاتِ نظم فارسی** کے مخطوطہ جس کا سال تالیف ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء ہے۔ اس میں اپنا زائچہ بیان کیا تھا۔ مولانا عرشیؔ کے مطابق یہ مخطوطہ پٹنہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ مولانا نے وہ فارسی قصیدہ جس میں زائچہ پیش کیا گیا ہے درج کر کے اس پہ کہنا چاہا ہے کہ یہ خود غالبؔ کے قلم کا ہے۔ جس میں مرزا نے تاریخی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ پھر نجوم کے حوالے سے زائچہ کی تفصیل پیش کی ہے۔ جس سے مرزا کی طبیعت اور علمِ نجوم کے حوالے سے اس زائچہ میں پوری مطابقت ہے۔ غالبؔ کے اس پہلے زائچے کی طرح ایک اور زائچہ **کلیاتِ نظم فارسی** کے تیسرے ایڈیشن میں بھی اس قصیدے کے ساتھ درج کیا گیا جس میں پہلا زائچہ شامل تھا۔ لیکن دونوں میں واضح فرق ہے۔ پہلے کے مطابق ان کی ولادت یک شنبہ ہشتم رجب المرجب ۱۲۱۲ھ ہوئی جب کہ دوسرے میں ہجری ولادت ایک ہی ہے۔ مگر عیسوی ولادت غلط ہے۔ مولانا کہتے ہیں :

> ''زیرِ نظر دونوں زائچوں میں ان کی تاریخ پیدائش صبح روز یک شنبہ ہشتم رجب ۱۲۱۲ھ مندرج ہے۔ دوسرے زائچے میں اس کے مطابق آغاز ۱۷۹۰ء بھی لکھ دیا گیا۔''۲۰۰

مولانا کے خیال میں دوسرے زائچہ میں، جو مخطوطہ مذکور کے ص ۴۰ کے ساتھ چسپاں ہے، سرخ روشنائی سے ''نوشتہ حضرت نیر رخشاں مرحوم'' کے الفاظ درج ہیں جو کہ ان کے بیٹے سعید الدین احمد خان طالب کے معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اس نسخہ کے مالک وہ تھے۔ مولانا نے عیسوی سن غلط درج کرنے سے دوسرے نقاد مولانا مہر **تصنیفِ غالبؔ** اور مالک رام بحوالہ **ذکرِ غالبؔ** کی طرح اعتراض کیا ہے۔ لیکن ہجری سال میں کوئی بھی معترض نہیں ہے۔ البتہ آخر میں مولانا نے اس بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا ہے:

> ''رہ گیا سنہ عیسوی تو بعید نہیں کہ اس کا اضافہ ہندی نجوم کے قول پر کیا گیا ہو جس نے از روئے حساب ہندی اس زائچے کی توثیق کی تھی۔ کیوں کہ

اہل ہند کے بقول آفتاب برج جدی (مکر) میں داخلہ آغاز سال یعنی
جنوری کی کسی تاریخ کو ہوا کرتا ہے۔ خدا کرے غیب سے کوئی مرد کار
پیدا ہو اور وہ میرزا کے دونوں زائچوں کی جانچ کر کے اس گتھی کو سلجھا
دے۔"[۲۱]

۱۲۔ سبد باغ دودر:

یہ مضمون سہ ماہی "اُردو" کراچی جنوری تا مارچ جلد ۴۵ شمارہ ۱، سنہ ۱۹۶۹ء میں چھپا۔ بعد ازاں اسی سال ۱۹۶۹ء ہی میں انجمن ترقی اُردو نے اسے کتابی شکل میں بھی شائع کیا۔

فارسی کلیات کی طباعت کے بعد سبد چیں کے نام سے غالب نے وہ اشعار جمع کیے جو اس کلیات میں بعض وجوہات کی بنا پر شامل نہ ہو سکے۔ سبد چیں کو غالب کا آخری فارسی انتخاب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن سید وزیر الحسن عابدی کو اس کے علاوہ بھی ایک ایسا مجموعہ ملا جس میں غالب کی نظم و نثر دونوں موجود تھے جو سبد چیں سے بعد کی اشاعت تصور کیا گیا۔ مولانا عرشی نے اس مجموعہ کا تعارف تلخیص اور حواشی کا کام انجام دیا۔ یہ مضمون ان ہی اُمور پر مشتمل ہے۔ البتہ اس کے دیباچہ میں مولانا نے سید وزیر الحسن عابدی سے اختلاف بھی کیا ہے۔ عابدی نے اس کا سن تالیف ۱۲۸۳ھ بیان کیا ہے جو ان کی تحقیق کے مطابق اس کا تاریخی نام ہے۔ مولانا عرشی نے اپنے بیان میں لکھا ہے:

"مجھے یہاں دو تین باتیں عرض کرنا ہیں، پہلی یہ کہ سبد چیں، باغ
دودر سے پہلے کی تالیف معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ باغ کے دیباچہ میں
اس کا ذکر ہے۔ مرزا صاحب نے فرمایا ہے" حصہ نظم" (سبد چیں) کی
ترتیب کے بعد بعض دوست حصہ نثر کا سواد لائے۔"[۲۲]

کتاب کی تاریخ کے بارے میں مولانا کا موقف ہے کہ ۱۲۸۳ھ کتابت کے آغاز کا سال نہیں بل کہ اس کی تالیف کے آغاز کا سال ہے۔ مولانا نے دلیل یہ دی ہے کہ یہ کتاب اتنی طویل نہیں تھی کہ اس کے لکھنے میں ایک سال چار مہینے اور ۲۲ دن صرف ہوتے۔

ان اختلافات کے علاوہ مولانا نے اصل خطوط کی کیفیت وکمیت کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے موقف کی وضاحت کرنا چاہی ہے۔ "تعارف" کے آخر میں مولانا نے اپنی فطری انکساری سے کام لیتے ہوئے فرمایا ہے کہ کام کیے انھیں ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اسے شائع نہیں کیا تھا کہ وزیر الحسن عابدی اپنی کتاب شائع کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جناب مشفق خواجہ نے مولانا سے جب اصرار کیا تو انھوں نے اسے رسالہ "اردو" کے غالب نمبر کے لیے دوبارہ اکبر خان عرشی زادہ کے ذریعے سے مخطوطات میں سے نکلوا کر بھیج دیا ہے۔ آخر میں مولانا کا کہنا ہے کہ کیوں کہ اصل کتاب بھی چھپ گئی جسے وزیر الحسن عابدی نے اورینٹل کالج میگزین میں شائع کرایا۔ اس لیے عابدی کے حواشی اور تلخیص کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

۱۳۔ مقدمہ غالب فارسی (مرتبہ عرشی) کے چند اوراق:

یہ مضمون فروری/ مارچ ۱۹۶۹ء میں ماہ نامہ "شاعر" کے غالب نمبر جلد ۴۰، شمارہ ۳ صفحہ ۵۲۰ تا صفحہ ۵۲۹ پر شائع ہوا۔ پاکستان میں ماہ نامہ "نقوش" لاہور نے اپنی اشاعت بابت فروری ۱۹۶۹ء، شمارہ ۱۱۱ میں صفحہ ۳۹۲ تا صفحہ ۴۰۲ میں اس کو شائع کیا ہے۔

رسالہ "نقوش" میں شامل مضمون کے آخر میں ص ۴۰۲ پر تحریر ہے کہ یہ سنہ ۱۹۳۹ء میں لکھا گیا تھا البتہ نظر ثانی ۱۹۶۹ء میں ہوئی ہے۔

اس مضمون میں خطوط غالب کے حوالے سے مرزا کے کلیات فارسی کی تاریخی ترتیب کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ مضمون کے شروع میں مرزا کی ریختہ گوئی پر فارسی اثرات کی وضاحت کی گئی ہے۔ مولانا حالی کی شہادت بھی یادگارِ غالب سے سند کے طور پر درج کردی ہے مرزا کی فارسی گوئی کے آغاز کے سلسلے میں مولانا لکھتے ہیں:

> "ان کی باقاعدہ فارسی گوئی کا آغاز ۱۸۲۲ء (۱۲۳۸ھ) میں تسلیم کرنا پڑے گا"۔ ۲۳

ترتیب دیوان کے بارے میں مولانا کا خیال ہے کہ غالب کی عمر کے حساب سے ۱۸۲۷

(۱۲۵۳ھ) کے کچھ بعد تصور کرنا چاہیے۔ مرزا نے اپنے خطوط میں بعض جگہ تحریر کیا ہے کہ ان کے پاس کبھی بھی ان کا کلام جمع نہیں رہا۔ مولانا کو مرزا کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ اس قسم کے بعض اور مباحث بھی اس مضمون میں شامل ہیں۔

۱۴۔ دیوان غالب کا ایک نادر انتخاب:

یہ مضمون ماہ نامہ ''نقوش'' لاہور (غالب نمبر) بابت اکتوبر ۱۹۶۹ء شمارہ ۱۱۳ صفحہ ۳۱۳ تا صفحہ ۳۲۶ میں شائع ہوا ہے۔

غالبیات کے حوالے سے یہ مضمون مولانا عرشی کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ رضا لائبریری، رام پور میں مومن کا دیکھا ہوا اور تصحیح شدہ نسخہ ''دیوان مومن'' موجود تھا۔ مولانا عرشی نے بتایا ہے کہ اس کے شروع میں اور آخر میں کچھ ورق زائد ہیں جن میں غالب اور بعض دوسرے شعرا کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ مولانا نے مذکورہ بالا ''دیوانِ مومن'' سے اخذ کر کے اہلِ ذوق کے لیے پیش کر دیا۔ اس انتخاب کی کیفیت مولانا بیان کرتے ہیں:

> ''یہ انتخاب معمولی شکستہ آمیز خط میں کسی نامعلوم الاسم کاتب نے نقل کیا ہے۔ کاتب کم سواد نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ اس نے دو جگہ اسد کا املا ''ص'' سے لکھا ہے۔ انتخاب کے ۶ ورقوں میں شنجرف سے مسطر کشی کر کے درمیان میں شعر لکھے ہیں۔''۲۴

اس کے بعد مولانا نے اس انتخاب کے مآخذ مخطوطہ اور دیوان کا سراغ لگانا چاہا ہے۔ ان کے خیال میں غزلوں کی ترتیب ۱۲۳۸ھ کے نسخے کے مطابق ہونی چاہیے۔ اس کی اہمیت بتاتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

> ''یہ انتخاب کئی وجوہ سے اہم ہے۔ یہی وجہ تو ہے کہ دیوان غالب کا اتنا قدیم انتخاب کوئی دوسرا موجود نہیں ہے۔ دوسرے اس انتخاب کا متن جگہ جگہ متداول نسخوں سے الگ ہے۔ ان میں سے بعض کاتب کی غلطی نہیں معلوم ہوتے بلکہ ایسا نظر آتا ہے کہ نسخۂ اصل میں یہی الفاظ تھے۔''۲۵

ان مباحث کے بعد انتخاب کو ردیف وار ترتیب سے پیش کر دیا ہے۔

۱۵۔ غالب کی تاریخِ پیدائش:

یہ سب سے چھوٹا صرف ایک ہی صفحہ پر محیط مولانا کا ایک بیان تصور کرنا چاہیے جو غالبؔ کی ولادت کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ اس میں گزشتہ مضمون ''غالب کا زائچہ'' کا حوالہ دے کر انھوں نے مرزا کی تاریخ پیدائش متعین کی ہے۔ یہ بیان ماہ نامہ ''قومی زبان'' کراچی کے شمارے بابت ستمبر ۱۹۶۹ء، جلد ۳۵ شمارہ ۳، ص ۱۷ میں شائع ہوا ہے۔ مولانا کا کہنا ہے کہ ۸ رجب غالبؔ نے بزرگوں سے سنی سنائی تاریخ پیدائش بتائی ہے جب کہ مولانا کے نزدیک ان کی تاریخ ولادت اس طرح ہے:

> ''میری رائے میں غالبؔ کی تاریخِ پیدائش ۸ رجب نہیں بل کہ سیوم رجب ہے۔ اور مرزا کو اپنے بزرگوں سے سنی ہوئی تاریخ میں التباس ہو گیا ہے۔'' ۲۶

۱۶۔ غالب کا خودنوشت اُردو دیوان:

ماہ نامہ ''نگار'' پاکستان، بابت اگست ۱۹۶۹ء، شمارہ ۸، صفحہ ۶ تا ۱۱ پر مولانا عرشی کا یہ مضمون بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں انھوں نے **دیوان غالب** کی اپنے دور تک کی تحقیق کو غلط ثابت کیا ہے۔ آج تک **دیوان غالب** کے دریافت شدہ نسخوں میں نسخہ بھوپال یا نسخہ حمیدیہ کو قدیم ترین تصور کیا جاتا تھا۔ مولانا کے مطابق انھیں ایک اور قدیم ترین نسخہ دریافت ہوا جو اس سے بھی قبل کا ہے۔ اس نسخہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''چند دن ہوئے امروہہ کے ایک نوادر فروش توفیق احمد صاحب قادری چشتی کو کہیں سے **دیوان غالب** کا اس سے بھی زیادہ (نسخہ حمیدیہ سے) نادر اور اہم نسخہ دستیاب ہوا ہے۔ اس نسخہ میں ۶۳ ورق ہیں۔ غزلوں کا اندراج بیشتر ترچھا بیاض نما ہے۔ مکتوبہ حصے کا طول ۳۔۶ اور عرض ۲۔۱۴ انچ ہے۔ اگر حاشیے کو بھی ناپ میں شامل کرلیا جائے تو طول ۹ انچ اور عرض ۲۔۱۶ انچ ہے۔'' ۲۷

مولانا کے بیان کے مطابق عرشی زادہ نے اسے دوبارہ جلد کرایا ہے جس سے طول اور عرض بڑھ گیا ہے۔ البتہ یہ پہلے سے زیادہ محفوظ ہو گیا ہے۔ غزلوں میں سے اس میں ۲۰ غیر مطبوعہ غزلیں شامل ہیں۔ غزلوں کا نسخۂ حمیدیہ سے موازنہ کرنے سے مولانا اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ:

> "نو دریافت نسخہ از روئے زمانہ نسخۂ حمیدیہ سے مقدم ہے۔ اس دعوا کا مزید ثبوت یہ ہے کہ جو غزلیں نسخہ مذکور اور نسخۂ حمیدیہ میں مشترک ہیں ان کے مختلف شعروں کا متن زیر بحث میں پہلے اور تھا بعد میں مرزا صاحب نے ترمیم کر دی۔"[۴۸]

مولانا کے خیال میں اس میں ہر غزل تخلص کرتی ہے۔ جب کہ حمیدیہ میں اسدؔ اور غالب دونوں تخلص کی غزلیں موجود ہیں۔ اس نسخہ کے مرتب ہوتے وقت مرزا کی عمر ۱۹ برس تھی۔[۴۹]

بعد سعی و کاوش سے دستیاب شدہ مندرجہ بالا مضامین و مقالات کے سرسری تعارف سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے تاہم توفیق الٰہی سے امیدوار ہوں کہ انھیں کتابی صورت میں یک جا کرسکوں تاکہ غالبؔ شناسی کی روایت اور تحقیقِ غالب میں ایک باب کا اضافہ ہو سکے۔ آمین! (ع۔ ر)

حواشی

۱۔ مولانا عرشی بحوالہ مضمون "خمار رسوم و قیود" مطبوعہ ماہ نامہ "نیرنگ" رام پور، بابت جولائی ۱۹۳۶ء۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ مولانا عرشی۔ بحوالہ نسخۂ حمیدیہ کی فروگزاشتیں۔ (نسخہ بھوپال کی روشنی میں)۔ مطبوعہ سہ ماہی صحیفہ (غالب نمبر سوم) لاہور ص ا، بابت مئی ۱۹۶۹ء، ج ۱۲، شمارہ ۳۱۔

۴۔ مولانا عرشی: نسخۂ حمیدیہ کی فروگزاشتیں (نسخہ بھوپال کی روشنی میں) مطبوعہ سہ ماہی "صحیفہ" لاہور "غالب مرحوم" جلد ۱۲، شمارہ ۴۸، ص ۲۔

۵۔ مولانا عرشی: بحوالہ: ''نسخۂ حمیدیہ کی فروگزاشتیں، (نسخۂ بھوپال کی روشنی میں) مطبوعہ سہ ماہی صحیفہ۔ لاہور (غالب نمبر۲) (جلد۱۲، شمارہ ۴۸، ص ۴۔۵)۔

۶۔ بحوالہ ایضاً، ص ۴۸۔

۷۔ بحوالہ ''غالب کا دربار اور خلعت''۔ مولانا عرشی: مطبوعہ ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی۔ بابت فروری/ مارچ ۱۹۶۹ء۔

۸۔ مولانا عرشی: غالب کا دربار اور خلعت، ص ۲۱۷۔ مطبوعہ ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی (غالب نمبر)۔

۹۔ مولانا عرشی: غالب کی چند نئی اُردو تحریریں ص ۵، مطبوعہ سہ ماہی ''اردو'' شمارہ ا، ۱۹۷۹ء۔

۱۰۔ ''غالب کی نئی اُردو تحریریں''۔ ص ۷، مطبوعہ سہ ماہی ''اُردو'' شمارہ ا، ۱۹۷۹ء۔

۱۱۔ بحوالہ: ''غالب کی نئی اُردو تحریریں۔ ص ۷، مطبوعہ سہ ماہی ''اُردو'' شمارہ ا، ص ۱۹۷۹ء۔

۱۲۔ مولانا عرشی، بحوالہ ''دیوان غالب کا اُردو کا ایک نادر مخطوطہ'' ص ۵، مطبوعہ ماہنامہ نقوش، لاہور، بابت جون ۱۹۶۰ء۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۸۔

۱۴۔ مولانا عرشی، بحوالہ دیوان غالب کا اُردو کا ایک نادر مخطوطہ'' ص ۸، مطبوعہ ماہنامہ نقوش، لاہور، بابت جون ۱۹۶۹ء۔

۱۵۔ مولانا عرشی: ''نسخۂ حمیدیہ اور بجنوری'' ص ۵۴۳، مطبوعہ رسالہ ''العلم'' بابت جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۵۵۴۔

۱۷۔ مولانا عرشی: دیوان غالب نسخۂ عرشی۔ ص ۷، مطبوعہ ''نوائے ادب'' بمبئی بابت اکتوبر ۱۹۶۴ء۔

۱۸۔ مولانا عرشی۔ غالب کی نئی فارسی تحریریں۔ ص ۲۳۴، مطبوعہ ''ماہِ نو'' کراچی جنوری/ فروری ۱۹۶۹ء۔

۱۹۔ مولانا عرشی' غالب کی چند نئی فارسی تحریریں۔ ص ۲۳۳، مطبوعہ ''ماہ نو'' کراچی، جنوری/

فروری ۱۹۶۹ء۔

۳۰۔ مولانا عرشی: مرزا کا زائچہ۔ ص ۳۶ مطبوعہ "ماہِ نو" کراچی جنوری/فروری۔ ۱۹۶۹ء۔

۳۱۔ ایضاً ص ۳۷۔

۳۲۔ مولانا عرشی: **سبدِ باغِ دودر** (تعارف، تلخیص و حواشی) مطبوعہ انجمن اردو، کراچی، ۱۹۶۹ء۔

۳۳۔ عرشی: مقدمہ: **دیوانِ غالب فارسی** (مرتبہ عرشی) کے چند اوراق، ص ۳۹۳ مطبوعہ ماہ نامہ "نقوش" لاہور بابت فروری ۱۹۶۹ء۔

۳۴۔ مولانا عرشی۔ **دیوانِ غالب** کا ایک نادر انتخاب ص ۳۱۳۔ مطبوعہ ماہ نامہ نقوش، لاہور۔ غالب نمبر بابت اکتوبر ۱۹۶۹ء۔

۳۵۔ مولانا عرشی: **دیوانِ غالب** کا ایک نادر انتخاب، ص ۳۱۴ مطبوعہ: نقوش، غالب نمبر بابت اکتوبر ۱۹۶۹ء۔

۳۶۔ مولانا عرشی: غالب کی تاریخ پیدائش ص ۱۷، مطبوعہ "قومی زبان" کراچی بابت ستمبر ۱۹۶۹ء۔

۳۷۔ مولانا عرشی: غالب کا خود نوشت اردو دیوان۔ ص ۶، مطبوعہ "نگار" پاکستان، بابت اگست ۱۹۶۹ء۔

۳۸۔ مولانا عرشی: غالب خود نوشت "اردو دیوان" ص ۸، مطبوعہ "نگار" پاکستان، اگست ۱۹۶۹ء۔

۳۹۔ بحوالہ ایضاً۔ ص ۱۱۔

ساتواں باب

کتابیات

◆◆

۱۔ آزاد، محمد حسین۔ آب حیات۔ ۱۹۵۲ء۔ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور
۲۔ آغا باقر۔ بیان غالب۔ ۱۹۳۹ء
۳۔ آفاق دہلوی۔ نادرات غالب۔ ۱۹۴۷ء
۴۔ الطاف حسین حالی۔ یادگار غالب۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء۔ سندھ اکیڈمی، کراچی۔
۵۔ امتیاز علی خان عرشی (مرتبہ و مدونہ) مکاتیب غالب۔ طبع اول ۱۹۳۷ء۔ مطبع قیمہ، بمبئی۔
۶۔ امتیاز علی خان عرشی (مرتبہ و مدونہ) مکاتیب غالب۔ طبع دوم ۱۹۴۳ء۔ سرکاری، رامپور
۷۔ امتیاز علی خان عرشی (مرتبہ و مدونہ) مکاتیب غالب۔ طبع چہارم ۱۹۴۶ء
۸۔ امتیاز علی خان عرشی، انتخاب غالب۔ طبع اول۔ ۱۹۴۲ء۔ مطبع قیمہ، بمبئی۔
۹۔ امتیاز علی خان عرشی، فرہنگ غالب۔ طبع اول۔ ۱۹۴۷ء۔ مطبع ناظم برقی پریس، رامپور۔
۱۰۔ امتیاز علی خان عرشی، دیوان غالب نسخۂ عرشی۔ طبع اول۔ ۱۹۵۸ء۔ طابع۔ انجمن ترقی اردو، ہند، علی گڑھ۔
۱۱۔ امتیاز علی خان عرشی، دیوان غالب نسخۂ عرشی۔ طبع دوم ۱۹۸۲ء۔ طابع ایضاً
۱۲۔ امتیاز علی خان عرشی، سبد باغ دو در۔ طبع اول ۱۹۶۹ء۔ انجمن ترقی اردو، پاکستان۔
۱۳۔ امیر مینائی (منشی) انتخاب یادگار۔ ۱۹۷۹ء۔
۱۴۔ جیلانی کامران۔ غالب کی تہذیبی شخصیت۔ ۱۹۷۲ء۔
۱۵۔ حسرت موہانی۔ دیوان غالب مع شرح۔ ۱۹۰۶ء۔
۱۶۔ حنیف رامے۔ دیوان غالب مصور۔ ۱۹۶۵ء
۱۷۔ خلیق انجم۔ غالب کی نادر تحریریں۔ ۱۹۶۱ء۔
۱۸۔ خلیفہ عبدالحکیم۔ فکر غالب۔ ۱۹۵۴ء۔
۱۹۔ خواجہ احمد فاروقی۔ تذکرہ سرور۔ ۱۹۶۱ء

۲۰۔ رام بابو سکسینہ۔ (ہسٹری آف اردو لٹریچر) مترجمہ مرزا محمد عسکری۔ مرتبہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، مطبوعہ علمی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۶۸ء۔

۲۱۔ سجاد باقر رضوی۔ شکور احسن۔ غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں۔ ۱۹۶۹ء۔

۲۲۔ سرسید احمد خان۔ آثار الصنادید۔ طبع اول، ۱۹۶۶ء۔ مطبوعہ انٹرنیشنل پریس۔ کراچی۔

۲۳۔ سید عبداللہ۔ میر امن سے عبدالحق تک۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ۱۹۶۵ء۔

۲۴۔ سید عبداللہ۔ شعرائے اُردو کے تذکرے۔ مطبع جدید اُردو ٹائپ پریس، لاہور۔ ۱۹۶۸ء۔

۲۵۔ سید عبداللہ۔ اطراف غالب۔ ۱۹۶۸ء۔

۲۶۔ سلیم چشتی۔ شرح دیوان غالب۔ ۱۹۵۹ء۔

۲۷۔ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی۔ تذکرہ جلوہ خضر۔ ۱۸۸۳ء۔

۲۸۔ شوکت سبزواری۔ غالب فکر و فن۔ ۱۹۶۱ء

۲۹۔ شیخ محمد اکرام۔ حکیم فرزانہ۔ طبع اول۔ ۱۹۵۸ء۔

۳۰۔ شیخ محمد اکرام۔ ارمغان غالب۔

۳۱۔ شیخ محمد اکرام۔ غالب نامہ۔ طبع ثانی۔ ۱۹۶۸ء۔

۳۲۔ عبادت بریلوی۔ غالب اور مطالعہ غالب۔ طبع اول، ۱۹۶۹ء۔

۳۳۔ عبادت بریلوی۔ اُردو تنقید کا ارتقاء۔

۳۴۔ عبدالباری، آسی۔ مکمل شرح غالب۔ ۱۹۳۱ء۔

۳۵۔ عبدالرحمن بجنوری۔ محاسن کلام غالب۔ ۱۹۲۱ء۔

۳۶۔ عبداللطیف (ڈاکٹر)۔ غالب (انگریزی) ۱۹۲۸ء، (مترجمہ سید معین الدین قریشی)، جہانگیر بک ڈپو، دہلی، ۱۹۲۸ء۔

۳۷۔ غالب، اسداللہ خان۔ اردوئے معلی۔ حصہ اول۔ مارچ ۱۹۶۹ء۔ (مطبوعہ)

۳۸۔ غالب، اسداللہ خان۔ دیوان غالب۔ نظامی ایڈیشن۔ بدایون۔ ۱۹۱۳، ۱۹۲۲ء

۳۹۔ غالب، اسداللہ خان۔ نسخہ حمیدیہ۔ ۱۹۲۱ء

۴۰۔ غالب، اسداللہ خان۔ عود ہندی۔ ۱۸۶۸ء۔

۴۱۔ غلام حسین ذوالفقار۔ محاسن خطوط غالب۔ ۱۹۶۶ء۔

۴۲۔ غلام رسول مہر۔ غالب۔ طبع چہارم۔ ۱۹۳۶ء۔ مطبوعہ عالمگیر الیکٹریکل پریس، لاہور

۴۳۔ غلام رسول مہر۔ خطوط غالب۔ (مرتبہ مہر) طبع پنجم۔ ۱۹۸۲ء۔

۴۴۔ غلام رسول مہر۔ نوائے سروش۔ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز،

۴۵۔ فرمان فتح پوری۔ غالب شاعر امروز وفردا۔ ۱۹۷۰ء
۴۶۔ فرمان فتح پوری۔ اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ ۱۹۷۲ء
۴۷۔ فیاض محمود، اقبال حسین۔ تنقید غالب کے سو سال۔ ۱۹۶۹ء
۴۸۔ قصر النساء۔ (تحقیقی مقالہ) شیخ محمد اکرام بطور غالب شناس۔
۴۹۔ مالک رام۔ نذر عرشی۔ ۱۹۶۵ء۔ مطبوعہ جمال پرنٹنگ پریس، دہلی۔
۵۰۔ مالک رام۔ عیار غالب۔ مطبوعہ ۱۹۶۹ء
۵۱۔ مالک رام۔ ذکر غالب۔ طبع پنجم۔ ۱۹۷۶ء۔ مطبوعہ جمال پرنٹنگ پریس، دہلی۔
۵۲۔ محمد حیات خان سیال۔ احوال ونقد غالب۔ طبع اول۔ ۱۹۶۷ء۔ مطبوعہ نذر سنز، لاہور
۵۳۔ مختار الدین۔ احوال غالب۔ ۱۹۵۳ء۔
۵۴۔ ممتاز حسین۔ غالب ایک مطالعہ۔ ۱۹۶۹ء۔
۵۵۔ نادم سیتا پوری۔ غالب نام آورم۔ ۱۹۶۴ء۔
۵۶۔ نجمہ نیاز۔ (تحقیقی مقالہ) انیسویں صدی میں مطالعہ غالب کی روایت۔
۵۷۔ نظم طباطبائی۔ شرح دیوان غالب۔ ۱۹۰۱ء۔ اے۔ نیاز فتح پوری۔ مشکلات غالب۔ ۱۹۶۱ء۔
۵۸۔ نیر سلطانہ۔ (تحقیقی مقالہ) مولانا غلام رسول مہر بطور غالب شناس۔
۵۹۔ وحید قریشی۔ نذر غالب۔ ۱۹۷۰ء
۶۰۔ یگانہ چنگیزی۔ غالب شکن، آرمی پریس، آگرہ، ۱۹۳۵ء

اخبارات ورسائل

۱۔ رسالہ "اردو" "سہ ماہی" کراچی، شمارہ ۱۹، بابت ۱۹۷۹ء۔
۲۔ ماہنامہ "افکار" (غالب نمبر) کراچی۔ ۱۹۶۹ء۔
۳۔ ماہنامہ "الکتاب" (غالب نمبر) لاہور۔ فروری/ مارچ ۱۹۷۰ء
۴۔ رسالہ "العلم" کراچی۔ جنوری تا مارچ۔ ۱۹۶۹ء۔
۵۔ روزنامہ "انقلاب"۔ بابت یکم فروری۔ ۱۹۳۸ء۔
۶۔ اورینٹل کالج میگزین۔ لاہور ۲۶ جون ۱۹۳۸ء
۷۔ روزنامہ "حمایت اسلام"۔ بابت ۱۲ مئی۔ ۱۹۳۸ء۔
۸۔ ماہنامہ "ساقی" دہلی۔ بابت مارچ۔ ۱۹۳۸ء۔
۹۔ ماہنامہ "شاعر" (غالب نمبر) بمبئی۔ فروری/ مارچ۔ ۱۹۶۹ء۔

۱۰۔ سہ ماہی "صحیفہ" (غالب نمبر) لاہور۔ جولائی ۱۹۶۹ء۔

۱۱۔ ماہنامہ "قومی زبان" کراچی۔ بابت ستمبر ۱۹۶۹ء۔

۱۲۔ ماہنامہ "کتاب نما" ۱۹۳۸ء۔

۱۳۔ ماہنامہ "ماہِ نو" کراچی جنوری/فروری ۱۹۶۹ء۔

۱۴۔ ماہنامہ "ماہِ نو" کراچی/فروری/۱۹۷۰ء۔

۱۵۔ رسالہ "معارف" اعظم گڑھ۔ مئی ۱۹۳۸ء۔

۱۶۔ ماہنامہ "نقوش" لاہور۔ جون ۱۹۶۰ء۔

۱۷۔ ماہنامہ "نقوش" لاہور۔ نومبر ۱۹۶۳ء۔

۱۸۔ ماہنامہ "نقوش" لاہور، (غالب نمبر سوم) اکتوبر ۱۹۶۹ء۔

۱۹۔ ماہنامہ "نقوش" لاہور (خطوط نمبر)۔

۲۰۔ ماہنامہ "نقوش" لاہور (شخصیات نمبر)، اکتوبر ۱۹۵۶ء۔

۲۱۔ ماہنامہ "نقوش" لاہور، (مکاتیب نمبر)۔

۲۲۔ رسالہ "نگار" پاکستان (غالب نمبر) جنوری/فروری ۱۹۶۹ء۔

۲۳۔ رسالہ "نگار" پاکستان، بابت۔ اگست ۱۹۶۹ء۔

۲۴۔ نوائے ادب۔ بمبئی۔ اکتوبر۔ ۱۹۶۳ء

۲۵۔ رسالہ "نیرنگ" رامپور۔ بابت جولائی ۱۹۳۶ء۔

۲۶۔ ماہنامہ "ہمایوں" لاہور۔ بابت مئی ۱۹۳۸ء۔

باقیات:

۶۱۔ سید معین الرحمٰن، اشاریہ غالب، ۱۹۶۹ء۔

۶۲۔ سید معین الرحمٰن، تحقیقِ غالب۔

۶۳۔ سید معین الرحمٰن، غالب اور انقلاب ۱۸۵۷ء۔

۶۴۔ فیاض محمود، مدیر اعلیٰ، تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند، جامعہ پنجاب، لاہور۔

۶۵۔ اُردو ادب، جلد اوّل، ۱۹۷۱ء۔

۶۶۔ اُردو ادب، جلد دوم، ۱۹۷۱ء۔

۶۷۔ اُردو ادب، جلد سوم، ۱۹۷۱ء۔

۶۸۔ اُردو ادب، جلد چہارم، ۱۹۷۲ء۔

◆◆◆



عبدالرحمٰن بٹ

ولدیت: برکت علی بٹ

تاریخ پیدائش: ۲۵ ستمبر ۱۹۵۹ء

تعلیمی قابلیت: پی ایچ ڈی سکالر

رہائشی پتہ: الحاج سٹریٹ، کشمیری محلہ نزد جلو پارک،

جلو چنڈ، لاہور

رابطہ نمبر: ۰۰۹۲_۳۲۲_۴۳۰۷۷۷۸

ای میل: prof.arbutt@yahoo.com

تدریسی مصروفیات:

اعزازی لیکچرار اردو، گورنمنٹ انٹر کالج شرق پور ۱۹۸۳ء

لیکچرار اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، چونیاں ۱۹۸۵ء۔

لیکچرار اردو، گورنمنٹ اسلامیہ انٹر کالج، لاہور کینٹ ۱۹۸۹

اسسٹنٹ پروفیسر/ایسوسی ایٹ پروفیسر و صدر شعبہ اردو،

گورنمنٹ شالیمار کالج، لاہور۔ (نومبر ۱۹۹۶ء تا حال)

تحقیقی مقالات:

امتیاز علی خان عرشی بطور غالب شناس (ایم اے) ۱۹۸۳ء

کلب علی خان فائق کی ادبی خدمات (ایم فل) ۲۰۰۶ء

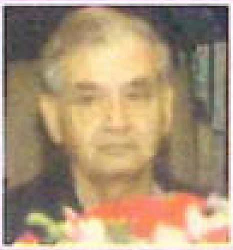
تدوین مقالات فائق (پی ایچ ڈی) ۲۰۱۳ء۔

بطور مرتب (زیر ترتیب و زیر طبع)

مقالات عرشی۔

مقالات فائق۔

تشکیل پاکستان میں اردو کا حصہ، از: کلب علی خان فائق



امتیاز علی عرشی اردو کے محققین میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ عربی، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور اردو میں تحقیق کرنے والوں کے لیے ان تینوں زبانوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔ یوں تو عرشی صاحب نے عمر بھر عمدہ تحقیقی کاموں کا سلسلہ جاری رکھا لیکن غالبیات پر تو وہ سند تسلیم کیے گئے۔ غالب کے بارے میں متعدد تحقیقی مضامین لکھنے کے علاوہ "مکاتیب غالب" اور "دیوان غالب" کی تدوین ان کے اعلیٰ درجے کے تحقیقی کارنامے ہیں جن کے ساتھ مبسوط مقدمات بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ "فرہنگ غالب" بھی ان کا ایک انتہائی اہم کام ہے۔

عبدالرحمٰن بٹ ان گنے چنے اہل قلم میں شامل ہیں جو سرسری تنقید لکھنے کی بجائے تحقیقی موضوعات کی طرف طبعی میلان رکھتے ہیں جو ہمارے دور کے طلبہ و اساتذہ میں ناپید ہو چکا ہے۔ بٹ صاحب نے زیر نظر کتاب ایم اے اردو کے مقالے کے طور پر لکھی تھی۔ بعد میں نئی تحقیقات کی روشنی میں مقالے پر مکمل نظر ثانی کی اور اب کئی سال بعد یہ مقالہ کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے تو اسے "دیر آید درست آید" قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب بڑی تحقیقی توجہ سے لکھی گئی ہے اور امتیاز علی عرشی جیسے محقق کو متعارف کرانے کے لیے ایک اہم کاوش کے طور پر ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

خواجہ محمد زکریا

پروفیسر امریطس (اردو)

پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

اظہار سنز

19۔ اردو بازار لاہور فون: 37230150

ہیڈ آفس: 9۔ ریتی گن روڈ لاہور فون: 37220761

E-mail: izharsons_2004@hotmail.com

www.izhar-sons.com